شعبان المعظم۔شوال المکرم ۱۴۴۲ھ
اپریل۔جون ۲۰۲۱ء

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

سات حصوں کے بجائے اب چار جلدوں میں

- خوبصورت قرآنی رسم الخط
- حتی الامکان اغلاط سے مبرا
- عمدہ سفید کاغذ
- معیاری طباعت
- دیدہ زیب ٹائٹل
- مضبوط ریگزین جلد
- متعدد ظاہری و معنوی خوبیوں کا مرقع
- بڑے سائز کے 2560 صفحات

قیمت (مکمل سیٹ) -/4800 روپے

مکتبہ خدّام القرآن لاہور

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرۃ: ۲۶۹)

سہ ماہی

حکمت قرآن

لاہور

جلد ۴۰ شمارہ ۲

شعبان المعظّم ۔ شوال المکرم ۱۴۴۲ھ اپریل ۔ جون ۲۰۲۱ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ـــ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہما اللہ

مدیر مسئول: ڈاکٹر عارف رشید

مدیر:

ڈاکٹر ابصار احمد

نائب مدیر:

حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت:

حافظ عاکف سعید ۔ حافظ عاطف وحید

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ ۔ مؤمن محمود

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۔ فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل: publications@tanzeem.org

سالانہ زرِتعاون: 280 روپے ، فی شمارہ: 70 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

اسلامی مسلّمات پر لبرل فکر و اطوار کا حملہ	ڈاکٹر ابصار احمد	3

تذکّر و تدبّر

مِلاکُ التأویل (۲۵)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	8

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی و نحوی تشریح	افاداتِ حافظ احمد یارؒ	25

حُسنِ مُعاشرت

ظِہار کا بیان	پروفیسر حافظ قاسم رضوان	41

تعلیم و تعلّم

مباحثِ عقیدہ (۳)	مؤمن محمود	60

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی مسلّمات پر لبرل فکر و اطوار کا حملہ

ڈاکٹر ابصار احمد

۳/اپریل ۲۰۲۱ء کو عوام سے براہِ راست ٹیلی فون کالز سننے کے پروگرام میں ایک کالر کی طرف سے پوچھے گئے سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیراعظم عمران خان کا کہنا تھا کہ اگرچہ ریپ اور جنسی جرائم کے بارے میں حکومت نے سخت قوانین بنائے ہیں لیکن ایسے جرائم کے بڑھنے کی وجوہات کو بھی دیکھنا ہوگا اور ان میں سے ایک وجہ فحاشی کا پھیلنا ہے۔ عمران خان کا کہنا تھا کہ ایسے واقعات کو روکنے کے لیے صرف قانون بنانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے پورے معاشرے کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ انہوں نے بجا طور پر کہا کہ اگر آپ معاشرے میں عریانی و فحاشی بڑھاتے جائیں گے تو اس کے اثرات لامحالہ ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے خواتین کے لیے مناسب ساتر لباس کی اہمیت کو اُجاگر کیا۔ جونہی وزیراعظم کے یہ خیالات پریس، چینلز اور سوشل میڈیا کے ذریعے وائرل ہوئے، حمایت میں کم اور مخالفت میں تیز و تند ردِّعمل کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ جس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ وطنِ عزیز کی کثیر آبادی بس رسماً مسلمان جبکہ ذہناً اور عملی طور پر اسلام کے بنیادی تصوّرات اور اقدار سے قطعاً شناسائی نہیں رکھتی۔ اور قرآن و سُنّت سے صریحاً متخالف و متضاد خیالات کے حق میں بولنے اور لکھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی۔ ان کی طرزِ معاشرت بھی مغربی انداز کی لبرل مخلوط معاشرت ہے۔ اور وہ دھڑلے سے اس کی وکالت کرتے ہیں۔ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا پر ان خواتین و حضرات نے Blaming the victim کے عنوان سے جو بودے دلائل اپنے افکار کے لیے دیے ہیں واقعہ یہ ہے کہ وہ ہر اعتبار سے مضحکہ خیز ہیں اور زمینی حقائق ان کی کھلی تردید کرتے ہیں۔ ان کے رشحاتِ قلم، اردو انگریزی اخباری کالم اور وزیراعظم کے خیالات پر اجتماعی میٹنگز کے احوال پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ آج طاقتور مغرب کی جانب سے نام نہاد متجدد مسلم دانشوروں پر ویسا ہی دباؤ ہے جیسا انیسویں صدی کے نوآبادیاتی دور میں تھا۔ جبکہ ہم اب ۷۳ سال سے قائم آزاد مملکت اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کے مسلمان شہری ہیں اور ہمیں اپنے معتقدات اور تہذیبی اقدار پر کسی قسم کی مداہنت اور کمپرومائز کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے۔

اس بارے میں کوئی دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ معاشرے کی اسلامی تشکیل قرآن و سُنّت کا پیغام عام کیے بغیر نہیں ہوسکتی۔ یہ فریضہ اوّلاً اسلامی معاشرے کے افراد اپنی معاشرت اور روزمرہ زندگی سے ادا کرتے ہیں، ثانیاً علماء اور مصلحینِ اُمّت اپنے عمل کے ساتھ زبان و قلم سے بھی کام لیتے ہیں۔ آج مغربی مفکّرینِ سماج و تہذیب نے

مساواتِ مرد وزن کے جس تصور کو عام کیا ہے اور انسانی حقوق کی آڑ میں فیمنزم کی جو تحریک مسلم ممالک میں بھی زور پکڑ رہی ہے اس نے شرم وحیا اور اخلاق (Decency) کی تمام حدود توڑ دی ہیں۔ ان سب پر حکومتوں کی طرف سے اسلامی قوانین وضوابط کی روشنی میں پابندی لگنی چاہیے۔

برسرِاقتدار حلقوں کی ترجیحات اور مجبوریوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم داعیانِ اسلام کو بہرحال اپنے حصے کا کام بھرپور انداز میں کرنا ہے اور دورِ جدید کے فتن، کفر والحاد اور تشکیک وارتیاب کو گہرائی میں سمجھ کر ابطال کرنا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ اور جذبہ اسلامی کے حامل افراد کے لیے قدیم 'علم الکلام' کے اصول، منہج اور مباحث سے تعارف حاصل کرنا ازبس ضروری ہے۔ اسلام کی تہذیبی اور کلچرل شناخت وقوت جہاں ایک درجے میں مظاہر (وضع قطع، لباس وآدابِ مجلس) میں بھی ہے، اس کی اصل روح ایک جاندار عقیدے (ایمان بالغیب) میں ہے اور وہ ایسا واضح، ثابت اور محکم عقیدہ ہے جس کا اثبات ہمیں قرآن کریم کے ہر صفحے پر ملتا ہے۔ پھر اس کی پشت پر ایک کامل شریعت اور اُسوۂ رسول ﷺ ہے جس کا بیان معلوم وثابت مراجع رکھتا ہے۔ ایمانیات کے اسی بیانیے کو ہمارے سلف صالحین اور اَساطین اُمّت نے جنہیں اللہ تعالیٰ نے بے پناہ قوتِ اَخذ وتجزیہ سے نوازا تھا، نیا بصیرت افروز قالب عطا کر کے تجدیدی کارنامہ سرانجام دیا ہے اور ہمارا یہی تُراثِ علمی مغربی ڈسکورس کے غلبے اور اذہان کی غلامی اور ماتحتی کے اس دور میں تریاق کا کام کرسکتا ہے۔ داعیوں کی اعلیٰ علمی حیثیت وصلاحیت ہی سیکولر گلوبلائزیشن اور ہمارے ملک میں اس کے پھیلاؤ اور اثرات کا توڑ کرسکتی ہے۔ انسانوں کے لیے لباس کی وضاحت خالقِ کائنات نے سورۃ الاعراف آیت ۲۶ میں کی ہے:

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝۲۶﴾

''اے آدم (علیہ السلام) کی اولاد! ہم نے تمہارے لیے لباس پیدا کیا جو تمہاری شرمگاہوں کو چھپاتا ہے اور موجب زینت بھی ہے۔ اور تقویٰ کا لباس، یہ اس سے بڑھ کر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ لوگ یاد رکھیں۔''

سَوْءات، جسم کے وہ حصے ہیں جنہیں چھپانا ضروری ہے، جیسے شرم گاہ، اور ریشًا وہ لباس جو حسن ورعنائی کے لیے پہنا جائے۔ گویا لباس کی پہلی قسم ضروریات اور دوسری قسم تکملہ واضافہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قسموں کے لباس کے لیے سامان اور مواد پیدا فرمایا۔ قصہ آدم وابلیس میں شیطان کا آدم وحوا کو بہکا کر اُس لباسِ جنّت سے (ایسا نورانی لباس جو اگرچہ غیر مرئی تھا لیکن شرم کے مقامات کے لیے ساتر--- پردہ پوش --- تھا) محروم کرنا تھا۔ اور پھر دونوں مارے شرم کے جنّت کے پتّے جوڑ جوڑ کر اپنے شرم کے مقامات چھپانے لگے۔ زیب وزینت اور آرائش کے لیے بھی اگرچہ لباس پہننا جائز ہے، تاہم لباس میں ایسی سادگی اور متانت زیادہ پسندیدہ ہے جو انسان کے زہد وورع اور تقویٰ کی مظہر ہو۔ معلوم ہوا کہ شرم وحیا کا مادہ انسان میں فطرتاً رکھا گیا ہے اور ساتر لباس پہننا سلیم

الفطرت اور صالحیت کی نشانی ہے۔قرآن کریم کی دو سورتوں --- سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب --- میں مسلمان خواتین کے لیے ستر وحجاب کے احکامات تفصیل سے دیے گئے ہیں۔مغربی تہذیب اور لبرل افکار کے ہاتھوں 'خاندان' جس طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے کوئی دریدہ ذہن ہی اس سے انکار کرسکتا ہے۔اوپر دی گئی آیت میں رِیْشًا (زیب وزینت) سے ظاہر ہے یہ مراد نہیں ہے کہ مسلمان خواتین زرق برق کے لباس زیب تن کر کے نامحرم مَردوں کے جمگھٹے میں سٹیج پر کیٹ واک شروع کر دیں۔صحیح مسلم کی حدیث میں نبی ﷺ نے ان عورتوں کے بارے میں بہت سخت اور عظیم وعید سنائی ان الفاظ میں کہ وہ نہ جنّت میں داخل ہوں گی اور نہ ہی اس کی ہوا کو پائیں گی جو کپڑے پہننے کے باوجود بھی ننگی ہوں گی' وہ مائل ہونے والی اور دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنے والی ہوں گی: كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مَائِلَاتٌ مُمِيْلَاتٌ۔صحیح بخاری کی روایت میں اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: رُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٌ فِي الْآخِرَةِ۔دنیا میں بہت سی کپڑے پہننے والیاں آخرت میں بے لباس ہوں گی۔بظاہر لباس پہنا ہوا ہے' لیکن اتنا باریک ہے کہ اس سے جسم جھلک رہا ہے' یا لباس تنگ ہے کہ عورت کے جسم کے دلفریب اعضاء نمایاں ہو کر دعوتِ گناہ دیتے ہیں' یا وہ اعضاء جیسے سینہ کا بالائی حصّہ' گردن' چہرہ' سر اور پورے بازو کھلے ہوئے ہیں جن کا ڈھانپنا از روئے شرع ضروری ہے' تو یہ ننگی ہیں۔ایسی عورتیں آج بر سر عام گھوم پھر رہی ہیں' اور یہ تمام خواتین مسلمان کہلاتی ہیں۔دوسری جانب قرآن و حدیث میں مَردوں کے لیے بھی شرم و حیا' لباس اور عمومی اخلاقی آداب کی تعلیمات ہیں۔چنانچہ انہیں بدنظری سے بچنے اور نگاہیں نیچی رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔

ہمارے جدیدیت گزیدہ اور مغرب پرست خواتین وحضرات جو وزیر اعظم کے ریمارکس پر ناشاد اور معترض ہیں' ان کے علمی و ذہنی افق پر نظر ڈال لیجیے۔ان میں کثیر تعداد متداول علوم ----- سائنسی وسماجی علوم ----- پڑھے ہوئے ہیں' لیکن سماجی علوم صرف وہی جن کی ترتیب وتسوید مغربی ممالک کے دانشوروں نے کی۔چنانچہ تہذیب و تمدن کے تمام مباحث میں لادینیت اور تشکیک والحاد ان کے اذہان کو بھی زنگ آلود کر گیا۔اگرچہ یہاں بھی ایک طرفہ تماشا ہے کہ جدید نفسیات کا اہم ترین مفکر --- سگمنڈ فرائڈ --- جو انسان میں جنسی خواہش (Sexual urge) کو بنیادی اور مرکزی تصور کرتا ہے' یہ اسے اپنے حالیہ ردّعمل میں بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں' اور انہیں جنسی جرائم کے اضافے میں فیشن زدہ عورتوں کا جنسی تہیج پیدا کرنے والا لباس چنداں نظر نہیں آتا۔یہ اپنی تقاریر' تحریروں اور اخباری کالمز میں قدیم وجدید دنیا جہان کے مفکرین کا حوالہ دیں گے' جس سے خود ان کی اپنی ژولیدہ فکری عیاں ہوتی ہے۔وہ نظریات اور ''گمانوں کے لشکر''☆ اور محدود فکری گھروندوں کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں اور ''یقین کا ثبات'' انہیں حاصل نہیں ہے۔آزادیٔ فکر اور ہیومن ازم کے افکار سے متاثر ہو کر یہ دانشور حضرات خبط عظمت کا شکار

☆علامہ اقبال کا شعر: گمانوں کے لشکر ' یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر (ساقی نامہ)

ہو گئے ہیں۔ کاش انہوں نے کبھی کچھ وقت اور صلاحیت اپنے دین کے مطالعے میں بھی صرف کی ہوتی، تو انہیں معلوم ہوتا کہ مسلمان کی بنیادی ترین شناخت مخلوق، عبد، غلام اور تابع فرمان فانی وجود ہے جس کے ہر ہر قول، عمل، نیت کا آخرت میں حساب لیا جائے گا۔ کتاب اللہ (قرآن کریم) اور سنّتِ رسولؐ ہمارے لیے دو انتہائی روشن ہدایت کی قندیلیں ہیں اور ہم ایمان و یقین کے ساتھ شاہراہِ زندگی پر سفر کر کے آخرت کے انعام و اکرام سے نوازے جا سکتے ہیں۔

عمران خان جنہوں نے اپنے سیاسی کیریئر میں اب تک سیاست دانوں اور سابقہ حکمرانوں کی کرپشن کی دہائی دی ہے، پہلی بار اسلامی حوالے سے ہماری ثقافت میں شرم و حیا اور اس میں خواتین کے لباس کی اہمیت پر زور دے کر اسلام پسند اور دینی اعتبار سے متحرک حلقوں کی تائید اور تحسین حاصل کی ہے۔ چنانچہ تنظیم اسلامی کے امیر شجاع الدین شیخ نے ان کی حمایت اور سماج میں اسلامی اقدار و احکام کی تنفیذ کا مطالبہ پریس ریلیز کے ذریعے کیا۔ حالاتِ حاضرہ کے پروگرام 'زمانہ گواہ ہے' میں اس موضوع پر جناب ایوب بیگ مرزا، ڈاکٹر محمد حسیب اسلم اور میزبان آصف حمید نے فکر انگیز اور جامع انداز میں گفتگو کی۔ اور کہا کہ مغرب کے مکمل نظریاتی اور تہذیبی انخلاء کو مقصود بنائے بغیر اسلامی نظریہ حیات جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ متعدد اخبار نویسوں نے بھی اخبارات میں وزیر اعظم کے خیالات کو سراہا۔ بالخصوص اور یا مقبول جان کے دو قسطوں میں اخباری کالم بہت مدلّل اور مؤثّر انداز میں مخلوط معاشرت، بے حجابی و فحاشی اور جنسی جرائم کے تدارک کے لیے اسلامی تعلیمات کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے کالمز کا مواد علمی تحقیق پر مبنی قیمتی جواہر پاروں پر مشتمل ہے۔ اسلامی سیکٹر میں قارئین مدیر ''ایقاظ'' جناب حامد کمال الدین سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے اس پر اپنے مخصوص انداز اور ہیش ٹیگز کے ساتھ مختصر فیس بک پوسٹ میں سیاسی دینی جماعتوں کو اس ایشو کی طرف متوجہ ہونے کی پُرزور دعوت دی ہے:

> ''حقیقی جمہوریت کے انتظار میں اسلام کے لیے تحریک چلانا ملک میں مؤخر رکھنا اگر کوئی صحیح حکمت ہوتی، تو پچھلے ستّر سال کے دوران ایک دن اسلام کے لیے صف آرا نہ ہو پاتے؛ اور نہ ایک غیر معینہ عرصے تک اس کی کوئی گنجائش۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ قرار دادِ مقاصد تا تکفیر قادیانیت تا دیگر اسلامی پیش رفتیں 'انہی پتھروں پر چل کر' ہاتھ آ پائی ہیں۔ پیش ازیں ہم اپنی ایک تحریر میں کہہ چکے: مذہبی گیٹ اپ کے ساتھ سیاست میں آنے کی صورت میں یہاں آپ کے لگانے کا نعرہ ''اسلام'' ہی ہے اور ''اسلام'' کے سوا کچھ نہیں۔ خدارا گھر آیئے۔ 'پرائے میلے میں' بہت ہو لیا! اپنی بنیاد پر عمل اور تحریک کی اٹھان اٹھایئے۔ لبرل یلغار کے پیش نظر آج اس کی جتنی ضرورت ہے شاید کمیونزم کے دور میں بھی نہیں تھی۔ اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ!''

دو اڑھائی ہفتے قبل سیکولر لبرل خیالات کے سرگرم مؤید اور ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی اہم شخصیت آئی۔ اے۔ رحمٰن کا انتقال ہوا، تو بعض کالم نویسوں نے ان کے کچھ شخصی اوصاف کا اچھے انداز میں ذکر کرتے ہوئے انہیں 'لبرل سیکولر درویش' تک کہہ دیا۔ اہل علم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ میں لفظ 'درویش' میں زہد، تقویٰ، للّٰہیت گندھے ہوئے ہیں اور یہ سب ایک صحیح العقیدہ مسلمان ہی میں پائے جاتے ہیں۔ جو دنیا کے عیش و

آرام کی بجائے آخرت کی ابدی زندگی میں کامیاب و کامران ہونے کے لیے تقویٰ‘ خشیت‘ قناعت اور صبر و شکر کے ساتھ زندگی میں فرائض دینی پر کاربند رہتا ہے۔

اپریل کے وسط میں انجمن خدام القرآن پشاور کے صدر جناب ڈاکٹر محمد اقبال صافی دارِ فانی سے دارِ بقا کی طرف کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ڈاکٹر صافی کی انجمن اور تنظیم اسلامی سے وابستگی تین دہائیوں پر مشتمل رہی ہے۔ انہوں نے ۱۹۹۱ء میں تنظیم کی رفاقت اختیار کی‘ اور تقریباً اسی وقت ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی ہدایت پر صوبہ سرحد (خیبر پختون خوا) میں انجمن خُدّام القرآن کا آغاز کیا۔ آپ نے تادمِ واپسیں ان دونوں سے پورے اخلاص اور تندہی سے تعلق نبھایا اور دعوتِ دین کے ضمن میں انتھک محنت کی۔ اپنے گھر کو مختلف میٹنگز اور دعوتی پروگراموں کے لیے استعمال کیا اور شرکاء کی مہمان نوازی گرمجوشی سے کرتے رہے۔ بانی تنظیم کے لیے ڈاکٹر صافی صاحب نے اپنے گھر کی انیکسی میں ایک کمرہ خاص طور پر استراحت اور شب بسری کے لیے رکھا تھا۔ راقم کو بھی ایک دو بار ان کے ہاں قیام اور مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل ’’بیان القرآن‘‘ کی طباعت و اشاعت کا آغاز بھی ڈاکٹر صافی کی مسلسل فرمائش و تاکید پر ہوا۔ اس کے لیے انہوں نے مسلسل دباؤ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور پر رکھا اور مالی تعاون بھی پیش کیا۔ اس کی بنا پر اس سے استفادہ کرنے والے ہر شخص پر ان کا یہ حق ہے کہ وہ ان کے لیے دعائے خیر کرے۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائیں اور جنّت الفردوس میں جگہ دیں۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ وَنَوِّرْ مَرْقَدَہٗ وَاَکْرِمْ مَنْزِلَہٗ وَحَاسِبْہُ حِسَابًا یَّسِیْرًا۔ آمین!

❁❁❁

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اَقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمد

اشاعت خاص 100 روپے، اشاعت عام 60 روپے

مِلاکُ التأوِیل (۲۵)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورۃُ الانفال

(۱۵۰) آیت ۷۲

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ ہَاجَرُوۡا وَ جٰہَدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ الَّذِیۡنَ اٰوَوۡا وَّ نَصَرُوۡۤا اُولٰٓئِکَ بَعۡضُہُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ؕ﴾

''بے شک جولوگ ایمان لائے' ہجرت کی اور اپنے مال اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے پناہ دی اور مدد کی' وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔''

اور سورۃ البراءۃ (التوبۃ) کی آیت ۲۰ میں ارشاد فرمایا:

﴿اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ ہَاجَرُوۡا وَ جٰہَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ ۙ اَعۡظَمُ دَرَجَۃً عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ﴾

''جولوگ ایمان لائے' ہجرت کی اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے مال اور اپنی جانوں کے ساتھ' وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں۔''

اس آیت میں ''فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ'' کے الفاظ ''بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ'' سے پہلے لائے گئے ہیں اور سورۃ الانفال میں اس کے برعکس ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ الانفال کی آیت میں اصل مقصود یہ ہے کہ اہلِ ایمان کی اعلیٰ صفات کو اُجاگر کیا جائے' جن میں ایمان' ہجرت اور خاص طور پر مال اور جان کا جہاد شامل ہے' جب کہ جان و مال کی محبّت لوگوں کی فطرت میں رچی بسی ہوئی ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

﴿وَاٰتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ﴾ (البقرۃ:۱۷۷)

''اور وہ مال کی محبّت کے باوجود اُسے عطا کرتے ہیں۔''

اور عربی زبان کے قواعد کے اعتبار سے کسی مجرور کو اس کی اہمیت کی بنا پر مقدّم کیا جاتا ہے' جیسے کہ ارشاد فرمایا:

﴿وَلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۴﴾ (الاخلاص)

''اور نہیں ہے اُس کے لیے کوئی بھی ہمسر۔''

اور جہاں تک سورۃ التوبہ کی آیت کا تعلق ہے تو وہاں ایمان، ہجرت اور جہاد کے حاملین کی ان لوگوں پر فضیلت دکھانا مقصود ہے جو حجاج کو پانی پلانے اور مسجد حرام (کعبہ) کی تعمیر و مرمت کو افضل مانتے تھے۔ فرمایا:

﴿اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۹)

''کیا تم نے مُحجاج کو پانی پلانا اور مسجد حرام کی تعمیر کرنا ان لوگوں کے ہم پلہ قرار دے دیا ہے جو اللہ پر ایمان لائے اور یومِ آخرت پر اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔''

تو یہاں اصل مقصود ''جہاد فی سبیل اللہ'' کو اُجاگر کرنا تھا، اس لیے ان کلمات کو پہلے لایا گیا۔ اور سیبویہ کے مطابق جار اور مجرور کو اگر پہلے لایا جائے تو اس کی اہمیت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہوتی ہے، جیسے سورۃ الاخلاص کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے، اور جیسے اس آیت میں ہے: ﴿وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ﴾ (البقرۃ:۳۶) ''اور تمہارے لیے زمین میں جائے قرار ہے''۔ دیکھئے یہاں ''فِي الْاَرْضِ'' کو پہلے لایا گیا کہ زمین کی بحیثیت قرارگاہ ہونے کو اُجاگر کیا جائے، اور یہی بات سورۃ الانفال کی آیت میں ''بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ'' کو پہلے لانے سے حاصل کرنا مقصود ہے۔ واللہ اعلم!

سُورۃُ التَّوبَۃ (البراءۃ)

(۱۵۱) آیت ۱۵

﴿وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۱۵﴾

''اور پھر اللہ پلٹے گا جس پر چاہے (اپنی رحمت کے ساتھ) اور اللہ جاننے والا ہے، حکمت والا ہے۔''

اور پھر آیت ۲۷ میں ارشاد فرمایا:

﴿ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۲۷﴾

''اور پھر اللہ اس کے بعد پلٹے گا جس پر چاہے گا (اپنی رحمت کے ساتھ) اور اللہ بخشنے والا ہے، رحمت کرنے والا ہے۔''

یہاں مؤمنین کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ قبول کیے جانے کی بشارت ہے، لیکن دونوں آیتوں کا اختتام اللہ کی مختلف صفات پر ہوا ہے۔ پہلی آیت میں ''عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ'' اور دوسری آیت میں ''غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ'' لایا گیا تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے، واللہ اعلم، کہ پہلی آیت سے ماقبل ان چند واقعات کی طرف اشارہ ہے جو مشرکین کی طرف سے ظہور پذیر ہوئے، جیسے بدر کے موقع پر ان کا مدینہ پر چڑھائی کرنا اور پھر بدر کے مقام پر جنگ کی نوبت آنا۔ اور پھر صلح حدیبیہ کے بعد صلح کی شرائط کو توڑنا، اور وہ ایسے کہ مشرکین کے حلیف بنوبکر نے رسول

اللہ ﷺ کے حلیف بنوخزاعہ پر چڑھائی کر دی اور قتل و غارت کا بازار سرگرم کر دیا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو قتال کا حکم دیا کہ وہ بدلہ لے سکیں اور انہیں قرار واقعی سزا دے سکیں۔ ارشاد فرمایا: ﴿قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾١٤ ’’ان سے قتال کرو، اللہ تمہارے ہاتھوں ان کو عذاب دے گا، انہیں رسوا کرے گا، تمہیں ان پر نصرت عطا کرے گا اور مومنوں کے سینوں کو ٹھنڈا کرے گا‘‘۔ اور پھر اس کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ط﴾ ’’اور جس پر چاہے گا (رحمت کے ساتھ) پلٹے گا‘‘۔ اور ان میں ابوسفیان، عکرمہ بن ابی جہل جیسے لوگ شامل ہیں جنہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کیے رکھا، لیکن پھر انہیں اسلام لانے کی توفیق عطا ہوئی اور یوں ان کی توبہ قبول ہوئی۔ اور پھر فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾١٥ یعنی اللہ کے علم سے کوئی چیز خارج نہ تھی، وہ اس لیے کہ اس کائنات میں ایک پتا بھی اللہ کی مرضی کے بغیر نہیں گرتا۔ اور پھر اللہ کی حکمت تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں سے قتال کریں اور اس کے بعد اپنے افعال پر نادم ہوں اور اس دین میں داخل ہو جائیں جس کی انہوں نے جان توڑ کر مخالفت کی تھی، اور اس بات کی توفیق انہی لوگوں کو ہوئی جنہیں اللہ نے چاہا۔

اور جہاں تک دوسری آیت کا تعلق ہے تو وہ غزوۂ حنین سے مناسبت رکھتی ہے۔ یہ وہ غزوہ ہے جس میں اہلِ ایمان کو ان کی ایک کمزوری پر تنبیہہ کی گئی ہے کہ وہ اپنی عددی کثرت کی بنا پر احساسِ فخر کا شکار ہو چکے تھے تو انہوں نے خود دیکھ لیا کہ یہ عددی کثرت ان کے کسی کام نہ آئی۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چند قلیل افراد رہ گئے تھے اور پھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے پکارا: اے انصار! (تم کہاں ہو؟) تو پھر کچھ لوگ پلٹے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر اور اہلِ ایمان پر سکینت نازل کی اور نصرت سے نوازا۔ اس قصے کے بعد آیات کا اختتام ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾٢٧ پر ہوتا ہے، جس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی توبہ کو شرفِ قبولیت سے نوازا جو راہِ فرار اختیار کر چکے تھے، لیکن پھر وہ پلٹ آئے اور اللہ کی رحمت ان کے شاملِ حال رہی۔ اور یوں دیکھا جا سکتا ہے کہ دونوں آیات کے اختتامی کلمات اپنی اپنی جگہ بالکل مناسب ہیں، واللہ اعلم!

(۱۵۲) آیت ۱۹

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾١٩

’’اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔‘‘

پھر آیت ۲۴ میں ارشاد فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾٢٤

اور آیت ۳۷ میں کہا: ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾٣٧

اور پھر منافقین کے ذکر میں ارشاد فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾٨٠

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان تینوں اوصاف: ظلم، فسق اور کفر کا یہاں لایا جانا کیا معنی رکھتا ہے؟

جواباً عرض ہے کہ ہر چہار آیات سے ماقبل جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ان اوصافِ مذکورہ سے پوری پوری

مناسبت رکھتا ہے۔ پہلی آیت کو لے لیجیے! اس سے قبل کُفّارِ قریش کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا:

﴿اَجَعَلْتُمْ سِقَایَۃَ الْحَآجِّ وَعِمَارَۃَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰھَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰہِ ؕ﴾ (آیت ۱۹)

''کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی تعمیر کرنے کو ان لوگوں (کے کام) کی طرح سمجھ لیا ہے جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں؟ اللہ کے نزدیک یہ سب برابر نہیں ہیں۔''

اب دیکھئے یہاں خطاب کُفّارِ قریش سے ہے جو اس گھمنڈ میں مبتلا تھے کہ ہم سے افضل کون ہو سکتا ہے؟ ہم تو حاجیوں کی خدمت کرتے ہیں اور کعبہ کی تعمیر میں مصروف رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے زعم باطل کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: نہیں! یہ دونوں گروہ برابر نہیں ہیں۔ اور پھر یہ بھی بتا دیا کہ وہ اس قول کی بنا پر اپنی جانوں پر ظلم کا ارتکاب کرنے والوں میں سے ہیں، اور اللہ کے سابق علم میں یہ بات آ چکی ہے کہ انہیں ہدایت نصیب نہ ہوگی!!

اور دوسری آیت کا پس منظر یہ ہے کہ اس آیت سے قبل اہلِ ایمان کو چند ایسی باتوں سے منع کیا گیا جو ان کے شایانِ شان نہیں۔ ان سے کہا گیا تھا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَکُمْ وَاِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ ؕ﴾ (آیت ۲۳)

''اے ایمان والو! اپنے آباء اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ کفر کو ایمان سے زیادہ قابلِ محبت سمجھیں۔''

یہاں انہیں اس بات سے منع کیا جا رہا ہے کہ چاہے وہ تمہارا باپ یا بھائی ہی کیوں نہ ہو اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کفر سے زیادہ محبت رکھتا ہے تو اُسے اپنا دوست نہ بناؤ اور پھر کہا: ﴿وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾ ''اور تم میں سے جو اُن سے دوستی رکھے گا وہ ظالم ہے''۔ اور پھر اس کے بعد فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ؕ﴾ (آیت ۲۴)

''کہہ دیجیے، اگر تمہیں اپنے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں، اپنے قبیلے، اپنی کمائی ہوئی دولت، اپنی تجارت جس کے ڈوب جانے کے خدشے میں تم (پریشان) رہتے ہو اور من پسند یدہ مکانات، تمہیں زیادہ عزیز ہیں بمقابلہ اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) کے، اور اُس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ کا حکم (یعنی عذاب) آ جائے۔''

اور پھر آیت کے اختتام پر ارشاد فرمایا: ﴿وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝۲۴﴾ ''اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا''۔ اور فسق کہا جاتا ہے کہیں سے نکل جانے کو، یعنی اللہ کی اطاعت سے نکل جانا۔ گویا وہ ایمان کے دائرے میں داخل ہو کر بھی اپنے اس طرزِ عمل سے ایمان سے خارج ہو گئے۔

اور جہاں تک تیسری آیت کا تعلق ہے تو اس سے قبل کُفار کی اس عادت کا تذکرہ کیا گیا ہے جسے النَّسِیء مہینوں کا منشا بدلتے رہنا‘ جیسے اگر کسی قبیلے سے لڑائی مقصود ہو تو محرم کے مہینے کو مؤخر کر دینا اور وہ اس لیے کہ محرم ان چار مہینوں میں سے ہے جن میں جنگ وجدال سے منع کیا گیا ہے) فرمایا:

﴿اِنَّمَا النَّسِیۡٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الۡکُفۡرِ یُضَلُّ بِہِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا﴾

’’بے شک نسیء کفر میں زیادتی ہے‘ جس سے وہ کافروں کو گمراہ کرتا ہے۔‘‘

اور پھر بتایا کہ کیسے یہ لوگ ایک سال اسے حلال کر لیتے ہیں اور پھر اگلے سال حرام قرار دیتے ہیں اور یوں ان کی آنکھوں میں ان کے بُرے کام بھی انہیں بھلے نظر آتے ہیں۔ اور پھر آخر میں ارشاد فرمایا: ﴿وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۳۷﴾﴾ ’’اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا‘‘۔ یہ لوگ چونکہ سرے سے ایمان میں داخل نہیں ہوئے تھے‘ بلکہ کفر ہی میں پروان چڑھے اور پھر کفر ہی میں بڑھتے گئے اس لیے یہاں صرف ’’کافرین‘‘ کے نام ہی سے ان کا ذکر کیا گیا۔

اور جہاں تک چوتھی آیت کا تعلق ہے تو وہ منافقین کے ایک گروہ کے بارے میں ہے۔ فرمایا: ﴿وَمِنۡہُمۡ مَّنۡ عٰہَدَ اللّٰہَ لَئِنۡ اٰتٰىنَا مِنۡ فَضۡلِہٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۷۵﴾﴾ ’’اور ان میں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اُس نے اپنے فضل میں سے ہمیں کچھ عطا کیا تو ہم صدقہ وخیرات دیں گے اور نیکوکاروں میں سے ہو جائیں گے‘‘۔ اور اس کے بعد اُن کے کرتوت بتائے کہ جب اللہ نے اپنا فضل کیا تو کنجوسی پر اتر آئے‘ بلکہ اُن مسلمانوں پر طعنہ زنی کرنے لگے جو اپنی محنت مزدوری میں سے جو کچھ دے سکتے تھے‘ اللہ کی راہ میں دے دیتے۔ پھر ایسے منافقین کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَفَرُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ ﴾ (آیت ۸۰) ’’اور یہ اس لیے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اُس کے رسول کو نہیں مانا۔‘‘

اب دیکھئے کہ یہ لوگ بظاہر اسلام کا دعویٰ کرتے تھے لیکن اسلامی تعلیمات سے ایسے نکلے جیسے چوہا اپنے بِل سے بھاگ نکلتا ہے‘ اس نکلنے کو ہی فسق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ عربی زبان میں کہا جاتا ہے: فَسَقَتِ الرُّطَبَۃُ عَنۡ قِشۡرِھا ’’تازہ کھجور اپنے خوشے سے باہر نکل آئی‘‘۔ اور یہی لفظ شیطان ابلیس کے لیے استعمال ہوا جو ایمان کا دعوے دار تھا‘ لیکن جب حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا تو آپے سے باہر ہو گیا۔ سورۃ الکہف میں ارشاد فرمایا: ﴿اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ کَانَ مِنَ الۡجِنِّ فَفَسَقَ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّہٖ ؕ﴾ (آیت ۵۰) ’’سوائے ابلیس کے‘ وہ جنّات میں سے تھا‘ تو پھر وہ اپنے ربّ کے حکم سے باہر نکل گیا‘‘۔ اور اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ ہر چہار آیات کا اختتام جن اوصاف پر ہوا ہے وہ سیاق وسباق کے لحاظ سے بالکل مناسب ہیں۔ واللہ اعلم!

(۱۵۳) آیت ۳۲

﴿یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ وَیَاۡبَی اللّٰہُ اِلَّاۤ اَنۡ یُّتِمَّ نُوۡرَہٗ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۳۲﴾﴾

''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں اور اللہ انکار کرتا ہے مگر یہ کہ اپنے نور کو کامل کرے چاہے کُفّار ناپسند کریں۔''

اور سورۃ الصّف میں ارشاد فرمایا:

﴿یُرِیۡدُوۡنَ لِیُطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ۸﴾

''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو مکمل کرنے والا ہے چاہے کُفّار ناپسند کرتے رہیں۔''

ملاحظہ ہو کہ دونوں آیات کا منشا و مقصد ایک ہے' لیکن سورۃ التوبہ کی آیت میں بمقابلہ آیت سورۃ الصّف دس حرف زائد ہیں' تو اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کے جواب میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سورۃ التوبہ میں اس آیت سے پہلے دو گروہوں یعنی یہود اور نصاریٰ کا قول ذکر ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿وَقَالَتِ الۡیَہُوۡدُ عُزَیۡرُۨ ابۡنُ اللّٰہِ وَقَالَتِ النَّصٰرَی الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ اللّٰہِ ؕ﴾ (آیت ۳۰)

''اور یہود نے کہا کہ عزیرؑ اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیحؑ اللہ کے بیٹے ہیں۔''

تو یہاں کلام میں طول پایا جاتا ہے' اس لیے اس کے جواب میں یہ آیت بھی قدرے طول کے ساتھ ہے۔ اور سورۃ الصّف کی آیت سے ماقبل صرف قومِ عیسیٰ کا مختصر جواب ہے۔ پہلے تو عیسیٰ علیہ السلام کا قول ملاحظہ ہو:

﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىۃِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُہٗۤ اَحۡمَدُ ؕ﴾ (آیت ۶)

''اے بنی اسرائیل! مَیں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں' تصدیق کرتا ہوں جو کچھ میرے سامنے تورات کا بیان ہے' اور میرے بعد آنے والے ایک رسول کی بشارت دیتا ہوں جس کا نام احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔''

اس کے بعد فرمایا:

﴿فَلَمَّا جَآءَہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ قَالُوۡا ہٰذَا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ۶﴾

''اور پھر جب وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو انہوں نے کہا: یہ تو کھلا کھلا جادو ہے۔''

اب دیکھئے ان کا جواب تین کلمات پر مشتمل ہے (ہٰذَا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ) تو اس کے بعد کی آیت میں بھی صرف تین کلمات ہیں بمقابل آیت التوبہ کے' جس کے چھ کلمات ہیں۔

اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ سورۃ الصّف میں صرف ایک گروہ کا قول نقل کیا گیا ہے جب کہ سورۃ التوبہ میں دو گروہوں کا قول بتایا گیا ہے اور اس لحاظ سے یہ کہنا مناسب ہے کہ جہاں اختصار تھا وہاں جواب میں بھی اختصار ملحوظ رکھا گیا اور جہاں طوالت تھی وہاں جواب میں بھی طوالت ملحوظ رکھی گئی۔ واللہ اعلم!

(۱۵۴) آیت ۴۲

﴿وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ اِنَّہُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ ۴۲﴾

''اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک وہ جھوٹے ہیں۔''

اور پھر اسی سورت کی آیت ۱۰۷ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاللّٰہُ یَشۡہَدُ اِنَّہُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ ﴿۱۰۷﴾﴾

''اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک وہ جھوٹے ہیں۔''

اور ایسے ہی سورۃ الحشر کی آیت ۱۱ اور سورۃ المنافقون کی آیت ۱ میں ''وَاللّٰہُ یَشۡہَدُ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ چاروں آیات کا مقصود ایک ہی ہے کہ منافقین باطنی طور پر کچھ ہیں اور بظاہر کچھ اور ہیں' اور اللہ ان کے جھوٹ اور فریب کا بخوبی علم رکھتا ہے' تو پھر صرف پہلی آیت میں اس بات کا اظہار ''یَعۡلَمُ'' کے ساتھ اور باقی تین آیات میں ''یَشۡہَدُ'' کے ساتھ کیوں کیا گیا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ التوبہ کی آیت سے قبل منافقین کی اس عذر تراشی کا ذکر ہے جس میں وہ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ہم میں استطاعت ہوئی تو ہم باقی مسلمانوں کے ساتھ جہاد کے لیے نکلیں گے۔ ارشاد فرمایا:

﴿لَوۡ کَانَ عَرَضًا قَرِیۡبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوۡکَ وَلٰکِنۡۢ بَعُدَتۡ عَلَیۡہِمُ الشُّقَّۃُ ؕ وَسَیَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰہِ لَوِ اسۡتَطَعۡنَا لَخَرَجۡنَا مَعَکُمۡ ۚ﴾ (آیت ۴۲)

''اور اگر مال ومتاع قریب الحصول ہوتا اور سفر بھی ہلکا ہوتا تو وہ آپ کے پیچھے پیچھے آتے' لیکن دور جانا ان کے اوپر گراں گزرا۔ اور یہ عنقریب اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہمارے اندر استطاعت ہوئی تو ہم تمہارے ساتھ ضرور نکلیں گے۔''

اب استطاعت ایسی چیز ہے جس کا اندازہ انسان خود کر سکتا ہے' دوسرے لوگوں کے لیے اس کا جاننا مشکل ہوتا ہے اِلّا یہ کہ قرائن سے اندازہ لگایا جائے۔ وہ اپنی اس بات میں سچے بھی ہو سکتے تھے اور جھوٹے بھی' مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ان کے بارے میں پہلے ہی سے بتا دیا کہ یہ سب جھوٹ بولیں گے' اور بعد میں حالات سے بھی اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ یہ لوگ عذر لنگ پیش کر رہے تھے' استطاعت اور قدرت تو تھی' لیکن جہاد پر جانے سے جی کترا گئے۔ اب چونکہ یہاں ان کی حیلہ تراشیوں کا ذکر پہلے ہی سے بتا دیا گیا تھا اس لیے اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم کا حوالہ دینا ہی مناسب تھا۔ اس لیے ارشاد فرمایا: ﴿وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ اِنَّہُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ ﴿۴۲﴾﴾۔

اب رہی سورۃ التوبہ کی دوسری آیت تو وہ مسجد ضرار کے حوالے سے ہے۔ ان منافقین کا مسجد ضرار بنانا ایک ایسا عمل تھا جو سب کے سامنے عیاں تھا۔ استطاعت کی طرح اس میں کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ اور اللہ چونکہ عالم الغیب والشہادۃ ہے تو اس لیے یہاں ''وَاللّٰہُ یَشۡہَدُ'' کے الفاظ لانا مناسب تھے' اور ایسے ہی سورۃ الحشر کا معاملہ ہے کہ وہاں بھی منافقین کے اس قول کا ذکر کیا گیا ہے جو انہوں نے اہلِ کتاب کو مخاطب کر کے کہا تھا اور جس میں ان کی نصرت اور اعانت کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ارشاد فرمایا:

﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ نَافَقُوۡا یَقُوۡلُوۡنَ لِاِخۡوَانِہِمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ لَئِنۡ اُخۡرِجۡتُمۡ لَنَخۡرُجَنَّ مَعَکُمۡ وَلَا نُطِیۡعُ فِیۡکُمۡ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنۡ قُوۡتِلۡتُمۡ لَنَنۡصُرَنَّکُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۱)

''کیا تم نے ان منافقین کو نہیں دیکھا کہ وہ اہل کتاب میں سے اپنے بھائیوں کو یہ کہہ رہے تھے کہ اگر تم نکالے گئے تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے' اور تمہارے بارے میں ہم کسی کا حکم نہیں مانیں گے' اور اگر تم سے لڑائی کی گئی تو ہم تمہاری نصرت کریں گے۔''

اور یہ ساری بات علی الاعلان ہوئی۔ اس میں کوئی مخفی بات نہ تھی' اس لیے یہاں بھی ﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۱﴾ کہنا ہی مناسب تھا۔

اور سورۃ المنافقون میں تو ان کا اپنا قول ہی رسول اللہ ﷺ کے بارے میں شہادت دینے کا تھا جب انہوں نے کہا: ﴿نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ﴾ ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔'' تو اس کے جواب میں ان کا جھوٹ ظاہر کرنے کے لیے یہ کہنا بالکل مناسب تھا کہ ﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱﴾ ''اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافقین بے شک جھوٹے ہیں''۔ واللہ اعلم!

(۱۵۵) آیت ۵۴

﴿وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝۵۴﴾

''اور ان کے خرچ کرنے (یعنی صدقات دینے) کو قبول نہیں کیا گیا مگر صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ کا اور اُس کے رسولؐ کا انکار کیا اور اس لیے کہ وہ نماز کے لیے آتے ہیں مگر سستی کے ساتھ اور اس لیے کہ وہ خرچ تو کرتے ہیں لیکن بڑی ناپسندیدگی کے ساتھ۔''

اور پھر اسی سورت کی آیت ۸۰ میں یوں ارشاد ہوا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۸۰﴾

''اور یہ کہ انہوں نے اللہ اور اُس کے رسولؐ کا انکار کیا۔ اور اللہ فاسق قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔''

اور پھر آیت ۸۴ میں ارشاد ہوا:

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰي قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸۴﴾

''اور ان میں سے جو مر جائے تو آپ ان پر کبھی نماز نہ پڑھیں اور نہ ہی ان کی قبر پر کھڑے ہوں۔ بے شک ان لوگوں نے اللہ اور اُس کے رسولؐ کا انکار کیا اور یہ لوگ فسق کی حالت میں مرے۔''

ملاحظہ ہو یہاں پہلی آیت میں ''كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ'' کے الفاظ ہیں' یعنی ''رَسُوْلِهٖ'' سے قبل حرف باء کا اعادہ کیا گیا ہے جبکہ باقی دونوں آیات میں ''كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ'' کہا گیا۔ یعنی حرف باء کا اعادہ نہیں کیا گیا۔ تو اس کی کیا وجہ ہے؟ جبکہ بظاہر تینوں آیات کا مقصود ایک ہی ہے!

جواباً عرض ہے کہ عربی زبان میں ایک ہی مضمون کو تین طریقوں سے ادا کیا جا سکتا ہے لیکن الفاظ و حروف کی بنا پر ان میں تاکید اور مزید تاکید کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ یوں کہیں: المانعُ مِنْ تقريبِ زيدٍ نفاقُه: ''زید

کوقریب کرنے میں اُس کا نفاق مانع ہے''۔اس جملے سے صرف یہ معلوم ہوا کہ زید کوقریب نہ لانے میں کون سا سبب مانع ہے۔اوراگر یوں کہیں:''اِنَّ الْمَانِعَ مِنْ تقریبِ زیدٍ نفاقُه ''بے شک زید کوقریب لانے میں اس کا نفاق مانع ہے'' یہاں''اِنَّ'' لاکراسی بات کوتاکید سے بیان کیا گیا ہے۔اوراگر یوں کہیں:''ما المانع من تقریب زید الا نفاقُه ''زید کوقریب لانے میں کوئی امر مانع نہیں ہے مگراس کا نفاق'' تو نہ صرف اس ترکیب سے مزید تاکید پیدا ہوگئی بلکہ ان الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہی ایک سبب ہے جو زید کوقریب لانے سے مانع ہے۔اوریہی وجہ ہے کہ اصولِ فقہ کے مطابق نبی ﷺ کے اس قول میں مفہومِ مخالف کا اعتبار کیا جائے گا۔''اِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ اَعْتَقَ'' بے شک حقِ وَلاء (کہ آقا اپنے غلام کا وارث ہونے کا حق رکھتا ہو) اُس کے لیے ہے جو اپنے غلام کو آزاد کرے۔(۱)

اوراس قول کے مقابلے میں اس دوسری حدیث میں مفہومِ مخالف کے اجراء کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے۔اوروہ یہ کہ''فی سائمةِ الغنم زکاةٌ''یعنی چرنے والی بکریوں میں زکاۃ ہے۔اوروہ اس لیے کہ پہلے قول میں ''اِنَّمَا'' کی وجہ سے عبارت میں حصر واقع ہوا'یعنی ایک سبب متعین ہوگیا تو اس سبب کے علاوہ تمام اسباب کی نفی ہوگئی۔اوردوسرے قول میں یہ تاکیدی الفاظ نہیں ہیں'اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بکریاں جو چرتی نہیں ہیں (یعنی مالک ان کی خوراک کا خود انتظام کرتا ہے) ان میں زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

بعض ماہرین اصولِ فقہ کے نزدیک مذکورہ عبارت مفہوم مخالف یا دلیل خطاب کے ضمن میں نہیں آتی بلکہ یہ ایک مستقل دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔حدیثِ بریرہؓ میں قولِ رسول ﷺ یعنی''اِنَّمَا الوَلَاء لِمَنْ أَعْتَقَ'' ایسے ہی ہے جیسے یوں کہا جائے: مَا الوَلَاء اِلَّا لِمَنْ اَعْتَقَ ''کہ حق ولاء نہیں ہے مگراُس شخص کے لیے جس نے غلام کوآزاد کیا ہو'اورکسی دوسرے کے لیے یہ وَلاء نہیں ہے۔یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (فاطر:۲۸) ''بے شک اللہ سے وہی ڈرتے ہیں اُس کے بندوں میں سے جو علم رکھتے ہیں''۔یعنی اللہ تعالیٰ سے جو ڈرنے کا حق ہے وہ صرف علماء ہی ادا کر سکتے ہیں۔اورایسے ہی یہ قولِ باریٔ تعالیٰ ہے:﴿اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ (النجم) ''وہ نہیں ہے مگرایک وحی جو کی گئی ہے''۔یعنی نبی ﷺ کا بولنا وحی کے تابع ہوتا ہے۔

اب دیکھئے کہ مذکورہ آیت میں جو زورِ بیان اورتاکید پائی جاتی ہے وہ نہ یوں کہنے میں ہے کہ''هُوَ وَحْيٌ يُّوْحٰى''اورنہ یوں کہنے میں کہ''اِنَّهٗ وَحْيٌ يُّوْحٰى''۔اب ہم اصل موضوع بحث کی طرف آتے ہیں کہ جو زورِ بیان اور تاکید اس آیت میں ہے:﴿وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ

(۱) حدیث بریرہؓ کی طرف اشارہ ہے کہ جس نے حضرت عائشہ ؓ سے اپنی آزادی کے حصول کے لیے زرِ آزادی میں مدد چاہی تھی لیکن بریرہ کے آقا نے کہا کہ حق وَلاء ہمارا ہوگا۔یعنی پیسہ تو حضرت عائشہ ؓ کا خرچ ہو کہ جس کی بنا پر بریرہؓ کوآزادی نصیب ہو'لیکن حق وَلاء پھر بھی اُس کے آقا کو حاصل رہے۔نبی ﷺ نے ان لوگوں کی بات کو ردّ کرتے ہوئے فرمایا کہ''بے شک حق ولاء تو اس کا ہے جس نے غلام کوخرید کرآزاد کیا''اوراس کا مفہومِ مخالف یہ ہوا کہ یہ حق دوسروں کو حاصل نہیں ہے۔

وَبِرَسُوْلِہٖ﴾ وہ بالکل واضح ہے کہ ان کے صدقات کی قبولیت میں کوئی چیز اگر مانع ہوئی ہے تو وہ ان کا کفر تھا۔ اور اس تاکیدی بیان کا تقاضا تھا کہ ''کَفَرُوْا بِاللّٰہِ'' کے بعد بِرَسُوْلِہٖ (باء کے اضافہ کے ساتھ) کہا جاتا تاکہ اس تاکید میں مزید زورِ بیان پیدا ہو جاتا۔ باقی دونوں آیات میں چونکہ تاکیدی مضمون نہ تھا اس لیے وہاں صرف ''اَنَّ'' کے ساتھ کلام کی ابتداء کی گئی اور فرمایا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ اور ﴿اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ تو واضح ہو گیا کہ ہر آیت اپنی اپنی جگہ پر موضوع کے اعتبار سے تاکیدی الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔

(۱۵۶) آیت ۵۴ اور ۵۵

﴿وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝۵۴ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾

''اور وہ خرچ نہیں کرتے ہیں مگر کراہت کے ساتھ۔ تو ان کے اموال اور نہ ہی ان کی اولاد آپ کو کسی تعجب میں ڈالیں۔ بے شک اللہ چاہتا ہے کہ وہ انہیں ان کی بنا پر دنیوی زندگی میں سزا دے۔''

اور پھر اس کے بعد آیت ۸۵ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا﴾

''اور تمہیں ان کے اموال اور اولاد تعجب میں نہ ڈالیں۔ بے شک اللہ چاہتا ہے کہ انہیں ان کی بنا پر دنیا میں سزا دے۔''

یہاں چار سوالات اُبھرتے ہیں:

(۱) ''فَلَا'' اور ''وَلَا'' کا فرق پہلی اور دوسری آیت میں۔

(۲) ''وَلَا اَوْلَادُهُمْ'' اور ''وَاَوْلَادُهُمْ'' پہلی میں ''لَا'' کے ساتھ اور دوسری میں ''لَا'' کے بغیر۔

(۳) ''لِيُعَذِّبَهُمْ'' اور ''اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ'' پہلی میں فعل سے پہلے ''لام'' ہے اور دوسری میں ''اَنْ''۔

(۴) ''فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' اور فِي الدُّنْيَا'' پہلی میں ''اَلْحَيٰوة'' کا لفظ زائد ہے۔

جوابات ملاحظہ ہوں:

(۱) جملہ شرطیہ کا جواب حرفِ فاء سے شروع ہوتا ہے (جیسے اردو میں ہم ''تو'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں' مثلاً اگر تم آؤ گے تو مَیں تمہارے ساتھ جاؤں گا)۔ اب مذکورہ جوابی جملے (فَلَا تُعْجِبْكَ) سے قبل اللہ تعالیٰ نے منافقین کے چند گھناؤنے اعمال کا تذکرہ کیا ہے' مثلاً یہ کہ ان کے صدقات اس لیے قبول نہ ہوئے کہ وہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا انکار کرتے رہے' اور یہ کہ وہ نماز بڑی کسل مندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور وہ یہ کہ جب وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو بڑے انقباض کے ساتھ خرچ کرتے ہیں۔ تو گویا اللہ کے رسول ﷺ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر ان کے یہی لچھن ہیں تو تم ان کے اعمال سے دھوکہ نہ کھانا اور یہ نہ سمجھنا کہ جو کچھ یعنی مال اور اولاد ان کو ہم نے دیا ہے وہ کوئی بطورِ احسان ہے' جیسے سورۃ المؤمنون میں ارشاد فرمایا:

﴿اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝۵۵ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا

يَشْعُرُوْنَ۝۵۶﴾

''کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں جو مال اور اولاد عطا کر رہے ہیں' وہ ہم ان کی بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں؟ نہیں' ان کو تو اس بات کا احساس ہی نہیں۔''

اور سورۂ آلِ عمران میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ﴾ (آیت ۱۷۸)

''اور کافر یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے جو مہلت انہیں عطا کی ہے وہ ان کے لیے بہتر ہے۔ (نہیں) ہم انہیں مہلت اس لیے عطا کر رہے ہیں کہ وہ گناہوں میں بڑھتے جائیں۔''

اور جہاں تک دوسری آیت کا تعلق ہے جہاں ﴿وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ۭ﴾ کہا گیا ہے تو اس سے قبل ایک حکم کا بیان ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓي اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰي قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸۴ وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ۭ﴾

''اور آپ ہرگز نماز نہ پڑھیں ان میں سے کسی پر بھی اور نہ ہی اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔ ان لوگوں نے اللہ اور اُس کے رسول کا انکار کیا' اور جب مرے تو حالتِ گناہ میں مرے۔ اور نہ ہی ان کے مال اور اولاد آپ کو تعجب میں ڈالیں۔''

یہاں جملہ شرطیہ اور جواب جملہ شرطیہ کی ترکیب نہیں ہے بلکہ اللہ کے رسول ﷺ کو ایک حکم دیا جا رہا ہے اور پھر چارج شیٹ بتائی جا رہی ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا اور اس لحاظ سے یہ پہلی آیت سے مختلف ہے۔ اور یہاں اس بنا پر ''فاء'' لانے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

(۲) اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں چند باتیں تاکید کے طور پر بیان کی گئی ہیں' منافقین کے چند گھناؤنے اعمال بتائے گئے ہیں اور اللہ کی اس سُنّت کو بیان کیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی دُنیوی شان و شوکت پر نہ جاؤ' یہ تو ان کا امتحان ہے۔ اور چونکہ یہاں تاکیدی بیان تھا اس لیے یہاں ''لَا'' کا اضافہ کر دیا گیا (جیسے اردو میں ''نہ'' کی تکرار تاکید کے لیے کی جاتی ہے' مثلاً: نہ بیٹے کام آئے' نہ دولت کام آئی)۔ اور چونکہ دوسری آیت میں شرط اور جوابِ شرط والا تاکیدی اسلوب نہ تھا اس لیے وہاں ''نہ'' (یعنی ''لَا'') کی تکرار نہیں تھی۔

(۳) تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ گو مآل کے اعتبار سے ان کا حکم ایک ہی ہے لیکن پہلی آیت میں چونکہ تاکیدی بیان تھا اس لیے ''لِيُعَذِّبَهُمْ'' (لامِ جر کے ساتھ) لایا گیا' جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا عذاب فوری طور پر ہوگا' اور دوسری آیت میں ''اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ'' میں صرف عذاب دیے جانے کا تذکرہ ہے اور وہ اس لیے کہ یہاں وہ تاکیدی اسلوب نہیں ہے جو کہ پہلی آیت میں ہے۔ اور جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا کہ لفظی مناسبت کی بنیاد پر یہ فرق روا رکھا گیا' لیکن آخرت کے اعتبار سے حکم وہی ایک باقی رہے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ ''لِيُعَذِّبَهُمْ'' میں جو لام ہے اسے ''لام کی'' کہا جاتا ہے' یعنی اس کے بعد ''اَنْ'' کو مضمر (چھپا ہوا) مانا جاتا ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ ''تا کہ'' کا مفہوم پیدا ہو جائے' یعنی اللہ چاہتا ہے تا کہ انہیں عذاب دیا جائے' تو یہاں بھی ''اَنْ'' چھپا ہوا مانا جا رہا ہے جو کہ دوسری آیت میں ظاہر کیا گیا ہے' یعنی ''اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ'' کہا گیا۔ اس کا جواب سیبویہ نے دیا ہے کہ ''اَنْ'' کا مضمر ہونا ہی اس بات کی علامت ہے کہ یہاں صرف لام لا کر اس بات کی طرف اشارہ ہو گیا کہ عذاب میں تاخیر نہ ہوگی' اور اسی لیے اس کے بعد ''اَنْ'' کو مضمر ہی رکھا گیا۔ اور جہاں ''اَنْ'' کو ظاہر کیا گیا تو یہ بتانا مقصود تھا کہ یہاں تاکید مقصود نہیں ہے۔ صرف عذاب کا آنا مقصود ہے۔ گویا کہا جا رہا ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ انہیں عذاب دے۔ اور اس جملے میں عذاب کے جلد آنے یا نہ آنے کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ واللہ اعلم!

(۴) چوتھے سوال کا جواب پچھلی دی گئی تفصیل کے مطابق سمجھا جا سکتا ہے۔ پہلی آیت میں تاکیدی مضمون تھا تو ''الحيٰوة الدُّنْيَا'' (دنیوی زندگی) کی پوری ترکیب لائی گئی اور دوسری آیت میں جہاں تاکیدی مضمون نہ تھا وہاں صرف ''فِي الدُّنْيَا'' کے الفاظ لائے گئے۔ تو ہر آیت اپنی اپنی جگہ پوری مناسبت رکھتی ہے۔

(۱۵۷) آیات ۸۶۔۸۷

﴿وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝۸۶ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۸۷﴾

''اور جب ایک سورت اترتی ہے (اس حکم کے ساتھ) کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اُس کے رسولؐ کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو ان میں سے مالدار لوگ آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیں کہ ہم ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو جائیں جو (پیچھے) بیٹھ جانے والوں میں سے ہیں۔ یہ لوگ اس بات پر راضی ہیں کہ پیچھے رہ جانے والی خانہ نشین خواتین کے ساتھ ہوں اور ان کے دلوں پر مہر لگ گئی ہے تو وہ سمجھتے نہیں ہیں۔''

اور اس کے بعد آیت ۹۳ میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۹۳﴾

''بے شک الزام تو اُن لوگوں پر آتا ہے جو باوجود دولت مندی کے آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں' وہ اس بات پر راضی ہیں کہ پیچھے رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ وہ خود بھی رہ جائیں' اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے تو وہ کچھ علم نہیں رکھتے۔''

یہاں دو سوالات ابھرتے ہیں:

پہلی آیت میں ''طُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ'' صیغہ مجہول کے ساتھ لایا گیا ہے اور دوسری آیت میں ''طَبَعَ اللّٰهُ'' کہہ کر فاعل یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے کہ جس نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔

دوسرا سوال اختتامی کلمات سے متعلق ہے۔ پہلی آیت میں ''فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ'' کہا گیا اور دوسری آیت میں ''فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ'' کہا گیا؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت کی ابتداء بھی ''وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ'' کے فعل سے ہو رہی ہے جو صیغہ مجہول کے ساتھ لایا گیا ہے تو مناسب تھا کہ بعد میں بھی ''طُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ'' کہہ کر صیغہ مجہول ہی سے آیت کا اختتام بھی کیا جائے' اور دوسری آیت میں مجہول کا صیغہ نہیں تھا اس لیے مناسب تھا کہ وہاں فاعل کا ذکر کیا جائے اور اس اعتبار سے کہا گیا: ''وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ''۔ اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں ایک ایسی چیز کا ذکر ہے جو فہم اور تدبر کی متقاضی ہے۔ کہا گیا کہ سورت کا نزول ہوا ہے جس میں اس بات کا حکم ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اُس کے رسولؐ کے ساتھ مل کر جہاد کرو۔ گویا ایمان کے مقتضیات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اور یہ بات فہم و تدبر کا تقاضا کرتی ہے' لیکن ان مالدار لوگوں کا پیچھے رہ جانے کی اجازت طلب کرنا اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ وہ فہم و تدبر سے عاری ہیں' اس لیے ان کے بارے میں کہا: ''فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ''۔

رہی دوسری آیت تو اس میں فہم و تدبر سے متعلق کوئی حکم نہیں ہے' صرف مالدار لوگوں کی بزدلی اور پست ہمتی کا ذکر ہے' تو یہاں ''علم'' یا اس چیز کی نفی کی گئی ہے جو انہیں فہم اور تدبر پر آمادہ کر سکتی تھی۔ اس لیے ارشاد فرمایا: ''طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ''۔

(۱۵۸) آیت ۹۴

﴿قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾﴾

''کہہ دیجیے' عذر مت پیش کرو' ہم تمہاری بات پر یقین نہیں رکھتے' اللہ نے تمہاری سب خبریں ہمیں بتا دی ہیں۔ اور اللہ تمہارے عمل کو دیکھے گا اور اُس کا رسول بھی' پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو غیب اور حاضر کو جاننے والا ہے تو پھر وہ تمہیں بتا دے گا وہ سب کچھ جو تم کرتے رہے ہو۔''

اور پھر آیت ۱۰۵ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾﴾

''اور کہہ دیجیے کہ تم کام کرتے رہو' اور پھر اللہ تمہارے عمل کو دیکھے گا اور اس کا رسول بھی اور اہل ایمان بھی' اور پھر تم عالم الغیب والشہادۃ کی طرف لوٹائے جاؤ گے تو وہ تمہیں وہ کچھ بتائے گا جو تم کرتے رہے تھے۔''

یہاں دونوں آیات کا تقابل ملاحظہ ہو:

وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ	فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ
وَرَسُوْلُهٗ	وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ
ثُمَّ تُرَدُّوْنَ	وَسَتُرَدُّوْنَ

کلمات کے ان اختلافات کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت خالص منافقین کے بارے میں ہے اور دوسری آیت اُن اہلِ ایمان کے بارے میں ہے جن میں کوتاہی پائی گئی اور بربنائے ایمان وہ امید کا دامن باندھے رہے۔ اور بقول الطبری یہ ان حضرات کے بارے میں ہے جن کا توبہ کا معاملہ مؤخر کر دیا گیا تھا' اور وہ لوگ تائب ہو چکے تھے۔ اب پہلے گروہ کا دوبارہ مطالعہ کریں' ان سے کہا گیا: ''کہہ دیجیے کہ عذر مت پیش کرو..... اللہ نے ہمیں تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے''۔ یعنی تم اپنی عذر تراشی میں سچے نہیں ہو اور اللہ نے تمہارے نفاق اور بدنیتی کے بارے میں ہمیں مطلع کر دیا ہے۔

''اور اللہ تمہارے عمل کو دیکھ لے گا اور اُس کا رسول بھی''۔ یہ جملہ ان کے لیے بطورِ تہدید (وارننگ) کے ہے' اس لیے واو العطف لایا گیا نہ کہ فاء التعقیب (یعنی فاء کے ساتھ عطف جو بطور جزا و سزا کے بھی لائی جاتی ہے)

یہاں اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ ''الْمُؤْمِنُون'' کا اضافہ نہیں ہے' اس لیے کہ یہاں ان کے نفاق کا تذکرہ ہے جسے اللہ تعالیٰ ہی بخوبی جانتے ہیں اور وہی اپنے رسول کو اس کا علم عطا کر سکتے ہیں' اور نفاق سے مراد یہی ہے کہ وہ کرتے کچھ ہیں اور ان کے دلوں میں کچھ اور ہوتا ہے۔ اور پھر کہا: ''اور پھر ہم تمہیں عالم الغیب والشہادۃ کی طرف لوٹائیں گے۔''

یہاں پر ''ثُمَّ'' کے حرف کے ساتھ بات کا آغاز کیا گیا۔ ''ثُمَّ'' میں باعتبار زمانہ تاخیر کی طرف اشارہ ہوتا ہے' یعنی وارننگ اور اس کے نتیجے میں جزا و سزا کے درمیان مہلت کو آشکار کرنا ہوتا ہے۔ یہ بات واو العطف سے حاصل نہیں ہوتی۔ یہ تو ان تین باتوں کا بیان ہو گیا جن میں دونوں آیات کے کلمات کا اختلاف تھا۔

اب آیئے دوسری آیت کی طرف جو غزوۂ تبوک کے ضمن میں ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تعلق رکھتی ہے جو غزوہ میں جانے سے رہ گئے تھے اور جنہوں نے صدقِ دل سے توبہ کی تھی۔ اب دیکھئے کہ اس آیت سے قبل ان اہلِ ایمان کا تذکرہ کن الفاظ کے ساتھ ہے:

﴿وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ (آیت ۱۰۲)

''اور کچھ دوسرے لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا۔ انہوں نے کچھ نیک عمل اور کچھ دوسرے بُرے عمل میں خلط ملط کر دیا تھا۔ اُمید ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول کر لے گا۔''

اور پھر ارشاد فرمایا کہ اے رسول!

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ (آیت ۱۰۳)

''ان کے مال میں سے صدقہ وصول کریں اور ان کی تطہیر کریں اور اس صدقہ کے ذریعے انہیں پاک وصاف کریں اور ان کے لیے دعا کریں۔''

اور ان کے مزید اطمینان کے لیے ارشاد فرمایا:

﴿اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ ھُوَ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ وَیَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ﴾ (آیت ۱۰۴)

''کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ کو قبولیت سے نوازتا ہے اور صدقات بھی قبول کرتا ہے۔''

اور اگر یہ کہا جائے کہ صدقہ لینے کا حکم تو سب اہلِ ایمان کے ساتھ عام ہے تو اس میں اہلِ تبوک کے ساتھ خاص ہونے کی بات کہاں سے آ گئی؟ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اس آیت کے بعد ایک خصوصی شہادت (گواہی) کا ذکر ہے' تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں خصوصی طور پر اہلِ تبوک کا تذکرہ ہے تاکہ ان کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی شہادت حاصل ہو سکے۔

دیکھئے یہاں انہیں حکم دیتے ہوئے کہا: ﴿قُلِ اعْمَلُوْا﴾ ''کہہ دیجیے کہ عمل کرتے رہو!''۔ یہاں جو اہل تبوک کے مُخَلَّفِیْن سے خطاب کیا جا رہا ہے اس میں ایک قسم کے اُنس کا اظہار ہے۔ نیک اعمال کے کرنے پر ابھارا جا رہا ہے تاکہ ان کی کوتاہیوں کا ازالہ ہو سکے۔ یہ ویسا ہی اسلوبِ بیان ہے جو سورۃ الزمر کی ان آیات میں چھلکتا ہے:

﴿قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ﴾ (آیت ۵۳)

''کہہ دیجیے اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔''

اور پھر فرمایا:

﴿وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ وَاَسْلِمُوْا لَہٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ﴾ (آیت ۵۴)

''اور اپنے رب کی طرف پلٹو اور اُس کی فرمانبرداری کرو اس سے پہلے کہ تمہیں عذاب آ لے۔''

اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ کہنا ''فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمْ'' (اور پھر اللہ تمہارے عمل کو دیکھے گا) یہاں فاءِ تعقیب جواب کے معنی میں ہے یعنی تم کام کرتے رہو تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھتا رہے گا' انہیں ضائع نہ کرے گا۔ یہاں ''الْمُؤْمِنُوْن'' کا اضافہ ہے ان معنوں میں کہ نیکی کے یہ اعمال اہلِ ایمان کے مشاہدے میں بھی آتے رہیں گے جو کہ ایک مسلمان کے قلبی اعتقاد کا غماز ہوتے ہیں' جیسے کہ حدیث میں آتا ہے کہ اگر تم ایک شخص کو پابندی کے ساتھ مسجد میں آتے دیکھو تو اُس کے ایمان کی گواہی دے دو! (احمدؒ' ترمذی بروایت ابوسعید الخدریؓ)

یہ بھی ملاحظہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مسجد کو آباد کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں۔ فرمایا:

﴿اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ .....﴾ (التوبۃ:۱۸)

''بے شک اللہ کی مساجد کو وہ لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لاتے ہیں .....''

اور اسی لیے یہاں اہلِ ایمان کی شہادت کا ذکر ہے جو خاص طور پر اُن لوگوں کے لیے ہے جو تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے اور پھر اپنی کوتاہی پر نادم ہوئے اور توبہ کرتے رہے' برخلاف اُن منافقین کے جن کے ظاہری اعمال اخلاص پر مبنی نہیں تھے' بلکہ وہ تو اپنے حلقہ کے لوگوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا کرتے تھے' جیسے ان آیات میں بتایا گیا:

﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ ۙ﴾ (البقرۃ:۱۴)

''اور جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے' اور جب اپنے شیاطین (ساتھیوں) سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔''

﴿وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ﴾ (المائدۃ:۶۱)

''اور جب وہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے' حالانکہ وہ کفر کے ساتھ داخل ہوئے تھے اور کفر کے ساتھ ہی خارج ہوئے تھے۔''

﴿يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ﴾ (آل عمران:۱۵۴)

''وہ اپنے نفوس میں وہ کچھ چھپائے رکھتے ہیں جو تمہارے سامنے ظاہر نہیں کرتے۔''

چنانچہ یہاں اعمالِ صالحہ کے مشاہدے کا تذکرہ ہو رہا ہے جسے اللہ کے رسول ﷺ اور ان کے ساتھ اہلِ ایمان بھی دیکھتے ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ کون پوری طرح عمل کر رہا ہے اور کون تھوڑی بہت کوتاہی کا مرتکب ہے۔

اب رہی یہ بات کہ پہلی آیت میں ''الْمُؤْمِنُوْن'' کا لفظ نہیں ہے' صرف اللہ اور اُس کے رسول کے دیکھنے کا ذکر ہے تو ہم پہلے ہی یہ واضح کر چکے ہیں کہ پہلی آیت ان منافقین کے بارے میں ہے جو اپنے نفاق پر قائم رہے' اور ان کے اعمال کے بارے میں اللہ نے ہی بتایا تھا' جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے: ﴿قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ﴾ (آیت ۹۴) ''اللہ نے ہمیں تمہاری خبریں بتا دی ہیں''۔ اس لیے یہاں اہلِ ایمان نے ان کے اعمال خود نہیں دیکھے بلکہ اللہ کے بتانے سے انہیں اس کا علم حاصل ہوا' اس لیے ''مُؤْمِنُوْن'' کا لفظ نہیں لایا گیا۔ یہ رائے طبری اور زمخشری دونوں کی ہے۔ اندلسی مفسر ابو محمد عبدالحق بن غالب بن عطیہ کے مطابق دوسری آیت بھی انہی منافقین کے بارے میں ہے جنہوں نے توبہ نہیں کی تھی اور یہ وہی منافقین ہیں جن کا آیت ۷۸ میں ان الفاظ کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے:

﴿اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ﴾

''کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ اللہ ان کے بھیدوں کو اور ان کی سرگوشیوں کو خوب جانتا ہے۔''

لیکن ہمارے نزدیک طبری کی رائے سیاق و سباق کے اعتبار سے صحیح ہے۔ واللہ اعلم!

(۱۵۹) آیت ۱۱۴

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾﴾

''بے شک ابراہیم نرم دل اور بُردبار ہیں۔''

اور سورۂ ہود میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾﴾

''بے شک ابراہیم بردبار' نرم دل اور جھکنے والے ہیں۔''

یہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ پہلی آیت میں وصف ''اَوَّاهٌ'' پہلے اور ''حَلِيْمٌ'' بعد میں ہے اور دوسری آیت میں اس کا اُلٹ ہے' تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ ''اَوَّاہٌ'' ابن عطیہ کے مطابق اُس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو بر بنائے حسرت‘ کثرت سے اپنے درد کا اظہار کرتا ہو‘ ایسے میں انسان کی زبان پر آہ‘ آہ کے الفاظ جاری ہو جاتے ہیں۔

سورۃ التوبہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے یہ الفاظ ان دو آیات کے اخیر میں وارد ہوئے ہیں:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾﴾

''نبی کے لیے اور نہ ہی ایمان والوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا کریں چاہے وہ ان کے قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں بعد اس کے کہ ان پر ظاہر ہو گیا ہو کہ وہ جہنم کے باسیوں میں سے ہیں۔''

﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾﴾

''اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے استغفار کرنا اس وعدے کی پاسداری کے لیے تھا جو انہوں نے باپ سے کیا تھا‘ لیکن جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اپنے باپ سے براءت کا اظہار کر دیا۔ بے شک ابراہیم نرم دل اور بردبار ہیں۔''

یہ وعدہ انہوں نے کب کیا تھا؟ اس کا حال جاننے کے لیے سورۂ مریم کی آیات ۴۱ اور ۴۷ کا مطالعہ کیجیے۔ دیکھئے ابراہیم علیہ السلام کس لجاجت اور نرمی سے اپنے باپ سے مخاطب ہیں:

﴿اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـــًٔا ﴿۴۲﴾﴾

''جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا: ابا جان! آپ ایسے (بتوں) کی پوجا پاٹ کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی آپ کے کسی کام آ سکتے ہیں۔''

اور اسی نہج پر وہ انہیں نصیحت کرتے چلے جاتے ہیں‘ انہیں اللہ کے عذاب سے بھی ڈراتے ہیں‘ یہاں تک کہ ان کا باپ انہیں سختی سے رد کر دیتا ہے اور انہیں دور چلے جانے کا کہتا ہے‘ وگرنہ وہ انہیں سنگسار کرنے سے گریز نہ کریں گے۔ اور اس کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾﴾

''انہوں نے کہا: تم پر سلام ہو‘ میں تمہارے لیے اپنے رب سے استغفار کروں گا‘ بے شک وہ مجھ پر حد درجہ مہربان ہے۔''

ان آیات کے تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے کہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وصف ''اَوَّاہٌ'' (حسرت اور اُمید کے ملے جلے جذبات) کا اظہار مقصود ہے‘ اس لیے یہ وصف پہلے بیان ہوا۔ لیکن سورۂ ہود میں ان اوصاف کے ذکر سے قبل ان کے پاس فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے جو قومِ لوط کی بستیاں اُلٹانے کے مشن پر وہاں جا رہے تھے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے مجادلہ شروع کر دیا تھا‘ اور اس لیے وہاں وصف ''حِلم'' (بردباری) کا پہلے ذکر کرنا زیادہ مناسب تھا۔ واللہ اعلم!

❁❁❁

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی ونحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان مرحوم

سورۂ ھُود

آیات ۱ تا ۸

﴿الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝١ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا
اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝٢ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ
يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا
فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝٣ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ۝٤ اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ
ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ ۢبِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝٥ وَمَا مِنْ
دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ
مُّبِيْنٍ ۝٦ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ
لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ
لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝٧ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى
اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ
بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝٨﴾

ترکیب

(آیت ۱) کِتٰبٌ خبر ہے۔ اس کا مبتدا ھٰذَا محذوف ہے۔ اُحْكِمَتْ اور فُصِّلَتْ کا نائب فاعل اٰيٰتُهٗ ہے۔ لَدُنْ مضاف ہے اور حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ اس کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے حالت جر میں ہیں۔ (آیت ۳)

فعل امر اِسْتَغْفِرُوْا اور تُوْبُوْا کا جواب امر ہونے کی وجہ سے یُمَتِّعْ اور یُؤْتِ مجزوم ہوئے ہیں۔ فَضْلَهٗ کی ضمیر کو ذِیْ فَضْلٍ کے لیے ماننا زیادہ بہتر ہے (پروفیسر احمد یار صاحب مرحوم)۔ اس لیے ہم ترجمہ اسی لحاظ سے کریں گے۔ (آیت ۷) لَيَقُوْلُنَّ کا فاعل الَّذِيْنَ اسم ظاہر آ گیا ہے اس لیے یہاں پر لَيَقُوْلَنَّ واحد آیا ہے۔ (آیت ۸) لَيَقُوْلُنَّ کا فاعل اسم ظاہر نہیں ہے بلکہ اس میں شامل ضمیر ہے اس لیے یہاں پر یہ جمع کے صیغے میں آیا ہے۔ لَيْسَ کا اسم اس میں شامل هُوَ کی ضمیر ہے جو اَلْعَذَابَ کے لیے ہے اور مَصْرُوْفًا اس کی خبر ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔

ترجمہ:

الٓرٰ: ا۔ل۔ر	كِتٰبٌ: (یہ) ایک کتاب ہے
اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ: محکم کیا گیا اس کی آیتوں کو	ثُمَّ فُصِّلَتْ: پھر ان کو کھولا گیا
مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ: ایک باخبر حکمت والے کے خزانے سے	اَلَّا تَعْبُدُوْٓا: کہ تم بندگی مت کرو
اِلَّا اللّٰهَ: مگر اللہ کی	اِنَّنِيْ: بے شک میں
لَكُمْ: تمہارے لیے	مِّنْهُ: اُس (کی طرف) سے
نَذِيْرٌ: ایک خبردار کرنے والا ہوں	وَّبَشِيْرٌ: اور ایک بشارت دینے والا ہوں
وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا: اور یہ کہ تم مغفرت مانگو	رَبَّكُمْ: اپنے رب سے
ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ: پھر تم رجوع کرو اُس کی طرف	يُمَتِّعْكُمْ: تو وہ فائدہ اٹھانے دے گا تم کو
مَّتَاعًا حَسَنًا: اچھے سامان سے	اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى: ایک مقرر وقت تک
وَّيُؤْتِ: اور وہ دے گا	كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ: ہر فضیلت والے کو
فَضْلَهٗ: اُس کی فضیلت	وَاِنْ تَوَلَّوْا: اور اگر تم لوگوں نے منہ موڑا
فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ: تو بے شک میں ڈرتا ہوں تم پر	عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ: ایک بڑے دن کے عذاب سے
اِلَى اللّٰهِ: اللہ کی طرف ہی	مَرْجِعُكُمْ: تم لوگوں کو لوٹنا ہے
وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ: اور وہ ہر چیز پر	قَدِيْرٌ: قدرت رکھنے والا ہے
اَلَآ اِنَّهُمْ: سن لو بے شک وہ لوگ	يَثْنُوْنَ: دوہرا کرتے ہیں
صُدُوْرَهُمْ: اپنے سینوں کو	لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ: تاکہ وہ چھپ جائیں اُس سے
اَلَا حِيْنَ: سن لو جس وقت	يَسْتَغْشُوْنَ: وہ چھپنا چاہتے ہیں
ثِيَابَهُمْ: اپنے کپڑوں (کے ذریعہ) سے	يَعْلَمُ: تو وہ جانتا ہے

مَا يُسِرُّوْنَ: اس کو جو وہ چھپاتے ہیں
اِنَّهٗ عَلِيْمٌ: بے شک وہ جاننے والا ہے
وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ: اور نہیں ہے کسی قسم کا کوئی چلنے والا
اِلَّا عَلَى اللّٰهِ: مگر اللہ پر
وَيَعْلَمُ: اور وہ جانتا ہے
وَمُسْتَوْدَعَهَا: اور اس کو بطور امانت رکھے جانے کی جگہ کو
فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ: ایک واضح کتاب میں ہے
خَلَقَ: پیدا کیا
فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ: چھ دنوں میں
عَرْشُهٗ: اُس کا عرش
لِيَبْلُوَكُمْ: تاکہ وہ آزمائے تم لوگوں کو
اَحْسَنُ: زیادہ اچھا ہے
وَلَئِنْ قُلْتَ: اور البتہ اگر آپ کہیں گے
مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ: موت کے بعد
الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا: وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا
سِحْرٌ مُّبِيْنٌ: ایک کھلا جادو
عَنْهُمُ الْعَذَابَ: ان سے عذاب کو
لَيَقُوْلُنَّ: تو وہ لازماً کہیں گے
اَلَا يَوْمَ: سن لو جس دن
لَيْسَ: تو وہ نہیں ہے
وَحَاقَ بِهِمْ: اور چھا جائے گا ان پر
وَمَا يُعْلِنُوْنَ: اور اس کو جو اعلانیہ کرتے ہیں
بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: سینوں والی (بات) کو
فِي الْاَرْضِ: زمین میں
رِزْقُهَا: اس کا رزق ہے
مُسْتَقَرَّهَا: اس کے ٹھہرنے کی جگہ کو
كُلٌّ: سب کچھ
وَهُوَ الَّذِيْ: اور وہ وہی ہے جس نے
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: آسمانوں اور زمین کو
وَّكَانَ: اس حال میں کہ تھا
عَلَى الْمَآءِ: پانی پر
اَيُّكُمْ: (کہ) تم میں سے کون
عَمَلًا: بلحاظ عمل کے
اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ: کہ تم لوگ اٹھائے جانے والے ہو
لَيَقُوْلَنَّ: تو لازماً کہیں گے
اِنْ هٰذَآ اِلَّا: نہیں ہے یہ مگر
وَلَئِنْ اَخَّرْنَا: اور البتہ اگر ہم ملتوی رکھیں
اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ: ایک گنتی کیے ہوئے عرصہ تک
مَا يَحْبِسُهٗ: کیا چیز روکتی ہے اس کو
يَاْتِيْهِمْ: وہ آئے گا ان کے پاس
مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ: پھیرا جانے والا ان سے
مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ: وہ جس کا وہ لوگ مذاق اڑاتے تھے

نوٹ ۱: البقرۃ:۸۷ کی لغت میں لفظ ''اُمَّۃٌ'' کے دو مفہوم دیے گئے ہیں: (۱) دین (۲) کسی دین کے پیروکار لوگ۔ اب نوٹ کر لیں کہ اس کا ایک تیسرا مفہوم بھی ہے، کسی دین یا اس کے پیروکاروں کے عروج کی مدّت یا عرصہ۔ اس مفہوم میں یہ لفظ قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے۔ ایک زیر مطالعہ آیت ۸ میں اور پھر سورۂ یوسف کی آیت ۴۵ میں۔

نوٹ ۲: آیت ۶ میں ہے کہ سب کا رزق اللہ کے ذمہ ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بعض جانور اور انسان بھوکے پیاسے مر جاتے ہیں۔ علماء نے اس کے متعدد جوابات دیے ہیں۔ ایک جواب یہ بھی ہے کہ رزق کی ذمہ داری اسی وقت تک ہے جب تک عمر پوری نہیں ہو جاتی۔ جب عمر پوری ہو گئی تو اس کو بہر حال مرنا ہے۔ اس کا عام سبب امراض ہوتے ہیں۔ کبھی جلنا یا غرق ہونا یا چوٹ یا زخم بھی سبب ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رزق بند کر دیا جائے جس سے موت واقع ہو جائے۔ (معارف القرآن)

نوٹ ۳: آیت ۷ میں ہے کہ اُس کا عرش پانی پر تھا۔ یہ جملۂ معترضہ ہے' جو غالباً لوگوں کے اس سوال کے جواب میں فرمایا گیا کہ آسمان اور زمین اگر پہلے نہ تھے تو پہلے کیا تھا؟ اس سوال کو نقل کیے بغیر اس کا مختصر جواب دیا گیا ہے کہ پہلے پانی تھا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس پانی سے مراد کیا ہے؟ یہی پانی جسے ہم اس نام سے جانتے ہیں یا یہ لفظ محض استعارے کے طور پر مادے کی اس مائع (fluid) حالت کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو موجودہ صورت میں ڈھالے جانے سے پہلے تھی۔ رہا یہ ارشاد کہ اُس کا عرش پانی پر تھا' تو اُس کا مفہوم ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ اس کی سلطنت پانی پر تھی۔ (تفہیم القرآن)

آیات ۹ تا ۱۶

﴿وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ۝۹ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝۱۰ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۱ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ ۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌ ۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝۱۲ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۳ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝۱۴ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝۱۵ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۶﴾

ترکیب

(آیت ۱۰) نَعْمَآءَ اور ضَرَّآءَ دونوں غیر منصرف ہیں۔ اَذَقْنَا کا مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے نَعْمَآءَ حالتِ نصب میں ہے جبکہ بَعْدَ کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے ضَرَّآءَ حالت جر میں ہے۔ اور ضَرَّآءَ نکرہ مخصوصہ ہے مَسَّتْهُ اس کی خصوصیت ہے۔ (آیت ۱۲) اسم الفاعل تَارِكٌ نے بَعْضَ کو نصب دی ہے۔ صَدْرُكَ مبتدأ مؤخر ہے اور ضَآئِقٌ اس کی خبر مقدم ہے۔ (آیت ۱۴) فَاِلَّمْ دراصل فَاِنْ لَّمْ ہے۔ (آیت ۱۵) مَنْ شرطیہ ہے۔ كَانَ

یُرِیْدُ کو ماضی استمراری ماننے کی گنجائش ہے، لیکن ہماری ترجیح ہے کہ کَانَ کو فعل ناقص مانیں۔ اس کا اسم اس میں شامل ضمیر ہے اور یُرِیْدُ سے آگے جملہ فعلیہ اس کی خبر ہے۔ اس طرح یہ جملہ اسمیہ ہوگا اور اس کا ترجمہ حال میں ہوگا۔ مَنْ کا جوابِ شرط ہونے کی وجہ سے نُوَفِّ مجزوم ہوا ہے، دونوں جگہ فِیْهَا کی ضمیر اَلْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا کے لیے ہے۔

ترجمہ:

وَلَئِنْ: اور البتہ اگر	اَذَقْنَا: ہم چکھا دیں
الْاِنْسَانَ: انسان کو	مِنَّا رَحْمَةً: اپنی (طرف) سے کوئی رحمت
ثُمَّ نَزَعْنٰهَا: پھر ہم کھینچ لیں اس کو	مِنْهُ: اس سے
اِنَّهٗ: تو بے شک وہ	لَیَئُوْسٌ: یقیناً بے انتہا مایوس ہے
کَفُوْرٌ: بے انتہا ناشکرا ہے	وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ: اور البتہ اگر ہم چکھائیں اس کو
نَعْمَآءَ: کوئی آسائش	بَعْدَ ضَرَّآءَ: ایسی تکلیف کے بعد
مَسَّتْهُ: اُس کو چھوا جس نے	لَیَقُوْلَنَّ: تو وہ لازماً کہے گا
ذَهَبَ السَّیِّاٰتُ: گئیں برائیاں	عَنِّیْ: مجھ سے
اِنَّهٗ لَفَرِحٌ: بے شک وہ یقیناً بہت خوش ہے	فَخُوْرٌ: بے انتہا فخر کرنے والا
اِلَّا الَّذِیْنَ: سوائے اُن لوگوں کے جو	صَبَرُوْا: ثابت قدم رہے
وَعَمِلُوا: اور عمل کیے	الصّٰلِحٰتِ: نیکیوں کے
اُولٰٓئِكَ: وہ لوگ ہیں	لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ: جن کے لیے مغفرت ہے
وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ: اور بڑا اجر ہے	فَلَعَلَّكَ: پس شاید کہ آپؐ
تَارِكٌ: چھوڑنے والے ہوں	بَعْضَ مَا: اس کے بعض کو جو
یُوْحٰٓى: وحی کیا گیا	اِلَیْكَ: آپؐ کی طرف
وَضَآئِقٌ: اور تنگ ہونے والا ہو	بِهٖ صَدْرُكَ: اس سے آپؐ کا سینہ
اَنْ یَّقُوْلُوْا: کہ وہ کہیں گے	لَوْلَآ اُنْزِلَ: کیوں نہیں اتارا گیا
عَلَیْهِ كَنْزٌ: انؐ پر کوئی خزانہ	اَوْ جَآءَ: یا (کیوں نہیں) آیا
مَعَهٗ: ان کے ساتھ	مَلَكٌ: کوئی فرشتہ
اِنَّمَآ اَنْتَ: کچھ نہیں آپؐ تو بس	نَذِیْرٌ: خبردار کرنے والے ہیں
وَاللّٰهُ: اور اللہ	عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ: ہر چیز پر
وَّكِیْلٌ: نگہبان ہے	اَمْ یَقُوْلُوْنَ: یا وہ لوگ کہیں گے
افْتَرٰىهُ: اس نے گھڑا ہے اس کو (یعنی قرآن کو)	قُلْ: آپؐ کہیے

فَأْتُوْا: تو تم لوگ لے آؤ	بِعَشْرِ سُوَرٍ: دس سورتیں
مِّثْلِهٖ: اس کے مانند	مُفْتَرَيٰتٍ: گھڑی ہوئیں
وَّادْعُوْا: اور تم لوگ بلالو	مَنِ: اُس کو جس کو
اسْتَطَعْتُمْ: (بلانے کی) تم استطاعت رکھتے ہو	مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اللہ کے علاوہ
اِنْ كُنْتُمْ: اگر تم لوگ	صٰدِقِيْنَ: سچ کہنے والے ہو
فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا: پھر اگر وہ جواب نہ دیں	لَكُمْ: تمہیں
فَاعْلَمُوْٓا: تو جان لو	
اَنَّمَآ اُنْزِلَ: کہ اس کو تو بس اتارا گیا	بِعِلْمِ اللّٰهِ: اللہ کے علم سے
وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ: اور یہ کہ کوئی بھی الٰہ نہیں ہے	اِلَّا هُوَ: مگر وہ
فَهَلْ اَنْتُمْ: تو کیا تم لوگ	مُّسْلِمُوْنَ: فرمانبرداری کرنے والے ہو
مَنْ كَانَ: جو کوئی	يُرِيْدُ: چاہتا ہے
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا: دُنیوی زندگی کو	وَزِيْنَتَهَا: اور اس کی زینت کو
نُوَفِّ: تو ہم پورا پورا دیں گے	اِلَيْهِمْ: ان کی طرف
اَعْمَالَهُمْ: ان کے اعمال (کے اجر) کو	فِيْهَا: اس (دنیا) میں
وَهُمْ فِيْهَا: اور وہ لوگ اس (دنیا) میں	لَا يُبْخَسُوْنَ: حق سے کم نہ دیے جائیں گے
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ: یہ وہ لوگ ہیں	لَيْسَ لَهُمْ: نہیں ہے جن کے لیے
فِي الْاٰخِرَةِ: آخرت میں	اِلَّا النَّارُ: مگر آگ
وَحَبِطَ: اور اکارت ہوا	مَا صَنَعُوْا: وہ جو انہوں نے کاریگری کی
فِيْهَا: اس (دنیا) میں	وَبٰطِلٌ: اور باطل ہونے والا ہے
مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: وہ جو یہ لوگ کرتے تھے	

نوٹ ۱: آیات ۹‘۱۰ میں یہ بات قابل غور ہے کہ دنیا کی آسائش اور تکلیف دونوں کے بارے میں قرآن کریم نے اَذَقْنَا یعنی چکھانے کا لفظ استعمال کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ اصل آسائش اور تکلیف آخرت کی ہے۔ دنیا کی آسائش اور تکلیف نہ تو مکمل ہیں اور نہ دائمی ہیں‘ بلکہ نمونے اور چکھنے کے درجہ میں ہیں‘ تاکہ انسان کو آخرت کی آسائش اور تکلیف کا کچھ اندازہ ہو سکے اور اس لیے بھی کہ یہاں کی راحت زیادہ خوش ہونے کی چیز نہیں ہے اور نہ یہاں کی تکلیف پر زیادہ غم کرنا چاہیے (معارف القرآن)۔ دُنیا میں اچھے برے حالات میں جو صحیح رویہ ہے‘ اس کی نشاندہی اگلی آیت ۱۱ میں کی گئی ہے۔

نوٹ ۲: آیت ۱۱ میں صبر کے ایک اور مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ صبر کی صفت اس تھڑدلا پن کی ضد ہے جس کا ذکر

آیات ۹، ۱۰ میں کیا گیا ہے۔ صابر وہ شخص ہے جو زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات میں اپنے ذہن کے توازن کو برقرار رکھے اور ایک معقول رویّہ پر ہر حال میں قائم رہے۔ اگر کبھی حالات سازگار ہوں تو کامیابی کے نشے میں مست ہو کر بہکنے نہ لگے۔ اگر کبھی مصائب و مشکلات ہوں تو انسانی سطح سے نیچے نہ اترے۔ اللہ کی آزمائش خواہ نعمت کی صورت میں آئے یا مصیبت کی صورت میں، وہ بہر حال بردباری پر قائم رہے۔ (تفہیم القرآن) اسی رویّہ کو آج کل جذباتی بلوغت (Emotional Maturity) کہتے ہیں۔

آیات ۱۷ تا ۲۴

﴿اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۗ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾﴾

خ ب ت

خَبَتَ يَخْبِتُ (ض) خَبْتًا: (۱) کسی کا چر چامٹ جانا۔ (۲) پست اور نرم ہونا۔

اَخْبَتَ (افعال) اِخْبَاتًا: پست اور نرم زمین میں اترنا، پستی اور عاجزی اختیار کرنا۔ زیر مطالعہ آیت ۲۳

مُخْبِتٌ (اسم الفاعل): عاجزی کرنے والا۔ ﴿وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾﴾ (الحج) ''اور آپؐ خوشخبری سنا دیں عاجزی کرنے والوں کو۔''

ترکیب

(آیت ۱۷) اس آیت کے معنیٰ مراد کو سمجھنے کے متعدد امکانات موجود ہیں، کیونکہ مَنْ کو جمع کے مفہوم میں بھی لیا جا سکتا ہے اور واحد بھی۔ اس وقت ایک غیر معیّن شخص بھی مراد ہو سکتا ہے اور رسول اللہ ﷺ بھی۔ بَيِّنَةٍ صفت

ہے‘اس کا موصوف محذوف ہے جو شریعت یا سبیل بھی ہوسکتا ہے اور فطرت کی بدیہیات بھی۔ پھر آگے آنے والی ضمیروں کے مراجع کے تعین میں بھی اختلاف ممکن ہے‘ اسی لیے اس آیت کے مختلف تراجم اور تفسیری اقوال ملتے ہیں۔ان میں سے کسی کو بھی غلط نہیں کہہ سکتے‘ صرف اپنی ترجیح بیان کر سکتے ہیں۔

مَنْ جمع کے مفہوم میں ہے‘ کیونکہ آگے اُولٰٓئِكَ آ رہا ہے۔ یہ مَنْ استفہامیہ ہے اور اس کے سوال کا جواب محذوف ہے جسے ترجمہ میں ظاہر کرنا ضروری ہے۔ بَيِّنَةٍ کا موصوف محذوف فطرت کی بدیہیات ہیں۔ يَتْلُوْهُ کی ضمیر بَيِّنَةٍ کے لیے ہے‘ کیونکہ مؤنث غیر حقیقی کے لیے مذکر اور مؤنث‘ دونوں میں سے کوئی بھی ضمیر آ سکتی ہے۔ مِنْهُ کی ضمیر رَبِّ کے لیے ہے‘ قَبْلِهٖ کی ضمیر شَاهِدٌ کے لیے ہے۔ كِتٰبُ مُوْسٰى مبتدأ مؤخر ہے‘ اس کی خبر محذوف ہے اور مِنْ قَبْلِهٖ قائم مقام خبر مقدم ہے جبکہ اِمَامًا اور رَحْمَةً حال ہیں۔ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ اور يَكْفُرْ بِهٖ کی ضمیریں شَاهِدٌ کے لیے ہیں۔ اَلْاَحْزَاب پر لام جنس ہے۔ (آیت ۱۸) يُعْرَضُوْنَ باب افعال کا نہیں بلکہ ثلاثی مجرد کا مجہول ہے۔ (آیت ۲۰) مُعْجِزِيْنَ اسم المفعول ہے جو فعل کا عمل کر رہا ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے جو اللہ کی راہ کے راہی یعنی مؤمنین ہوسکتا ہے۔

ترجمہ:

اَفَمَنْ كَانَ: تو کیا وہ لوگ جو ہوں	عَلٰى بَيِّنَةٍ: ایک شفاف (فطرت) پر
مِّنْ رَّبِّهٖ: اپنے رب (کی جانب) سے	وَيَتْلُوْهُ: اور اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہو
شَاهِدٌ: ایک گواہی دینے والا (قرآن)	مِّنْهُ: اُس (کی طرف) سے
وَمِنْ قَبْلِهٖ: اور اس سے پہلے	كِتٰبُ مُوْسٰى: موسیٰؑ کی کتاب ہو
اِمَامًا: رہنما ہوتے ہوئے	وَّرَحْمَةً: اور رحمت ہوتے ہوئے (ان کے برابر ہوں گے جو ان سے محروم ہیں؟)
اُولٰٓئِكَ: یہ لوگ ہی	يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ: ایمان لاتے ہیں اس (قرآن) پر
وَمَنْ: اور جو کوئی	يَّكْفُرْ بِهٖ: انکار کرے گا اس (قرآن) کا
مِنَ الْاَحْزَابِ: تمام گروہوں میں سے	فَالنَّارُ: تو آگ
مَوْعِدُهٗ: اُس کے وعدہ کی جگہ ہے	فَلَا تَكُ: پس آپؐ مت ہوں
فِيْ مِرْيَةٍ: کسی شک میں	مِّنْهُ: اس (قرآن) سے
اِنَّهُ الْحَقُّ: یقیناً یہی حق ہے	مِنْ رَّبِّكَ: آپؐ کے رب (کی جانب) سے
وَلٰكِنَّ: اور لیکن	اَكْثَرَ النَّاسِ: لوگوں کی اکثریت
لَا يُؤْمِنُوْنَ: ایمان نہیں لائے گی	وَمَنْ اَظْلَمُ: اور کون زیادہ ظالم ہے
مِمَّنِ افْتَرٰى: اُس سے جس نے گھڑا	عَلَى اللّٰهِ: اللہ پر

كَذِبًا: ایک جھوٹ
يُعْرَضُوْنَ: جو پیش کیے جائیں گے
وَيَقُوْلُ: اور کہیں گے
هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ: یہ وہ ہیں جنہوں نے
عَلٰى رَبِّهِمْ: اپنے رب پر
عَلَى الظّٰلِمِيْنَ: ظلم کرنے والوں پر
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اللہ کی راہ سے
عِوَجًا: کجی کو
هُمْ كٰفِرُوْنَ: ہی انکار کرنے والے ہیں
مُعْجِزِيْنَ: عاجز کرنے والے (مؤمنین کو)
وَمَا كَانَ لَهُمْ: اور نہیں ہے ان کے لیے
مِنْ اَوْلِيَآءَ: کوئی بھی کارساز
لَهُمُ الْعَذَابُ: ان کے لیے عذاب کو

السَّمْعَ: سن کر سمجھنے کی

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ: یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے
اَنْفُسَهُمْ: اپنے آپ کو
عَنْهُمْ مَّا: ان سے وہ جو
لَا جَرَمَ: کوئی شک نہیں
فِي الْاٰخِرَةِ: آخرت میں

اِنَّ الَّذِيْنَ: بے شک وہ لوگ جو
وَعَمِلُوا: اور عمل کیے
وَاَخْبَتُوْٓا: اور عاجزی اختیار کی
اُولٰٓئِكَ: وہی لوگ
هُمْ فِيْهَا: وہ اس میں

اُولٰٓئِكَ: وہ لوگ ہیں
عَلٰى رَبِّهِمْ: اپنے رب پر
الْاَشْهَادُ: گواہی دینے والے
كَذَبُوْا: جھوٹ کہا
اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ: سن لو! اللہ کی لعنت ہے
الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ: وہ لوگ جو روکتے ہیں
وَيَبْغُوْنَهَا: اور تلاش کرتے ہیں اس میں
وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ: اور وہ آخرت کا
اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا: وہ لوگ ہرگز نہیں ہیں
فِي الْاَرْضِ: زمین میں
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اللہ کے علاوہ
يُضٰعَفُ: کئی گنا کیا جائے گا
مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ: وہ استطاعت نہیں رکھتے تھے
وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ: اور وہ لوگ دیکھ کر سمجھتے نہیں تھے
خَسِرُوْٓا: گھاٹے میں ڈالا
وَضَلَّ: اور گم ہوا
كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ: وہ گھڑا کرتے تھے
اَنَّهُمْ: کہ وہ لوگ
هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ: وہی سب سے زیادہ گھاٹا پانے والے ہیں
اٰمَنُوْا: ایمان لائے
الصّٰلِحٰتِ: نیکیوں کے
اِلٰى رَبِّهِمْ: اپنے رب کی طرف
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ: جنّت والے ہیں
خٰلِدُوْنَ: ہمیشہ رہنے والے ہیں

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ: دوفریقوں کی مثال
وَالْاَصَمِّ: اور بہرے جیسا
وَالسَّمِيْعِ: اور سمیع جیسا
مَثَلًا: بلحاظ مثال کے
كَالْاَعْمٰى: (ایک) اندھے جیسا
وَالْبَصِيْرِ: اور (دوسرا) بصیر جیسا
هَلْ يَسْتَوِيٰنِ: کیا یہ دونوں برابر ہوں گے
اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ: تو کیا تم لوگ یاددہانی حاصل نہیں کرتے؟

آیات ۲۵ تا ۳۵

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲۵ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝۲۶ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝۲۷ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ۭ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝۲۸ وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝۲۹ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳۰ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۚ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۱ قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۳۲ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَاۗءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۳۳ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ هُوَ رَبُّكُمْ ڬ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۳۴ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝۳۵﴾

رذل

رَذِلَ يَرْذَلُ (س) رَذَالَةً: حقیر ہونا' گھٹیا ہونا۔
اَرْذَلُ (ج) اَرَاذِلُ (افعل التفضیل): زیادہ یا سب سے زیادہ حقیر' گھٹیا۔ ﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ﴾ (النحل: ۷۰) ''اور تم میں وہ بھی ہیں جن کو لوٹا دیا جاتا ہے عمر کے سب سے گھٹیا (حصہ) کی طرف''۔ اور زیر مطالعہ آیت ۲۷۔

لزم

لَزِمَ یَلْزَمُ (س) لِزَامًا: کسی سے چمٹ جانا' لازم ہونا۔ ﴿فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا﴾ (الفرقان) ''تم لوگ جھٹلا چکے ہو تو عنقریب وہ (یعنی عذاب) چمٹ جائے گا۔''

اَلْزَمَ (افعال) اِلْزَامًا: کسی کو کسی سے چمٹا دینا' لازم کرنا۔ زیر مطالعہ آیت ۲۸

زری

زَرٰی یَزْرِیْ (ض) زَرْیًا: کسی پر عتاب کرنا۔

اِزْدَرَأَ (افتعال) اِزْدِرَاءً: کسی کو حقیر سمجھنا۔ زیر مطالعہ آیت ۳۱

ترکیب

(آیت ۲۶) اَلِیْمٍ مضاف الیہ یَوْمٍ کی صفت ہے۔ یہ اگر مضاف عَذَابَ کی صفت ہوتا تو اَلْاَلِیْمَ آتا۔ (آیت ۲۷) بَادِیَ دراصل اسم الفاعل بَادٍ ہے۔ مضاف ہونے کی وجہ سے تنوین ختم ہوئی تو ی واپس آ گئی اور حال ہونے کی وجہ سے یہ حالت نصب میں ہے۔ اس کو اِتَّبَعَكَ اور اَرَاذِلُنَا دونوں کا حال ماننے کی گنجائش ہے۔ ہم اسے اَرَاذِلُنَا کا حال مانیں گے۔ (آیت ۲۸) نُلْزِمُكُمُوْهَا میں هَا کی ضمیر بَيِّنَةٍ کے لیے ہے۔

ترجمہ:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا: اور بے شک ہم بھیج چکے ہیں	نُوْحًا: نوحؑ کو
اِلٰی قَوْمِهٖٓ: انؑ کی قوم کی طرف	اِنِّیْ لَكُمْ: (انہوںؑ نے کہا) کہ میں تمہارے لیے
نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ: ایک واضح خبردار کرنے والا ہوں	اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا: کہ تم بندگی مت کرو
اِلَّا اللّٰهَ: مگر اللہ کی	اِنِّیْٓ اَخَافُ: بے شک میں ڈرتا ہوں
عَلَیْكُمْ: تم لوگوں پر	عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ: ایک دردناک دن کے عذاب سے
فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ: تو کہا اُن کے سرداروں نے جنہوں نے	كَفَرُوْا: کفر کیا
مِنْ قَوْمِهٖ: ان کی قوم میں سے	مَا نَرٰىكَ: ہم نہیں دیکھتے آپؐ کو
اِلَّا بَشَرًا: مگر ایک بشر	مِّثْلَنَا: اپنے جیسا
وَمَا نَرٰىكَ: اور ہم نہیں دیکھتے آپؐ کو	اتَّبَعَكَ: (کہ) پیروی کی آپؐ کی
اِلَّا الَّذِیْنَ: سوائے اُن لوگوں کے	هُمْ اَرَاذِلُنَا: (کہ) وہ ہمارے حقیر ہیں
بَادِیَ الرَّاْیِ: بادیٔ النظر میں	وَمَا نَرٰی لَكُمْ: اور ہم نہیں دیکھتے تمہارے لیے
عَلَیْنَا: ہم پر	مِنْ فَضْلٍ: کسی قسم کی کوئی فضیلت

بَلْ نَظُنُّكُمْ : بلکہ ہم گمان کرتے ہیں تم لوگوں کو

قَالَ يٰقَوْمِ : انہوں نے کہا: اے میری قوم

اِنْ كُنْتُ : (کہ) اگر میں ہوں

مِّنْ رَّبِّيْ : اپنے ربّ (کی طرف) سے

رَحْمَةً : ایک رحمت

فَعُمِّيَتْ : پھر وہ پوشیدہ کی گئی

اَنُلْزِمُكُمُوْهَا : تو (پھر بھی) کیا ہم چمٹا دیں تم لوگوں سے اس کو

لَهَا كٰرِهُوْنَ : اس سے کراہیت کرنے والے ہو

لَآ اَسْئَلُكُمْ : میں نہیں مانگتا تم سے

اِنْ اَجْرِيَ : نہیں ہے میرا اجر

وَمَآ اَنَا : اور میں نہیں ہوں

اٰمَنُوْا : ایمان لائے

مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ : اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں

قَوْمًا : ایک قوم کہ

وَيٰقَوْمِ : اور اے میری قوم

مِنَ اللّٰهِ : اللہ سے (بچنے میں)

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ : تو کیا تم لوگ یاددہانی حاصل نہیں کرتے؟

عِنْدِيْ : میرے پاس

وَلَآ اَعْلَمُ : اور میں نہیں جانتا

وَلَآ اَقُوْلُ : اور میں نہیں کہتا

وَّلَآ اَقُوْلُ : اور میں نہیں کہتا

تَزْدَرِيْ : حقیر دیکھتی ہیں

لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ : (کہ) ہرگز نہیں دے گا ان کو اللہ

كٰذِبِيْنَ : جھوٹ کہنے والے

اَرَءَيْتُمْ : کیا تم لوگوں نے غور کیا

عَلٰى بَيِّنَةٍ : ایک واضح (دین) پر

وَاٰتٰنِيْ : اور اُس نے دی مجھ کو

مِّنْ عِنْدِهٖ : اپنے پاس سے

عَلَيْكُمْ : تم پر

وَاَنْتُمْ : اس حال میں کہ تم لوگ

وَيٰقَوْمِ : اور اے میری قوم

عَلَيْهِ مَالًا : اس پر کوئی مال

اِلَّا عَلَى اللّٰهِ : مگر اللہ پر

بِطَارِدِ الَّذِيْنَ : ان کو دھتکارنے والا جو

اِنَّهُمْ : بے شک وہ لوگ

وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ : اور لیکن میں دیکھتا ہوں تم کو

تَجْهَلُوْنَ : تم لوگ غلط عقائد رکھتے ہو

مَنْ يَّنْصُرُنِيْ : کون مدد کرے گا میری

اِنْ طَرَدْتُّهُمْ : اگر میں دھتکار دوں ان کو

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ : اور میں نہیں کہتا تم سے (کہ)

خَزَآئِنُ اللّٰهِ : اللہ کے خزانے ہیں

الْغَيْبَ : غیب کو

اِنِّيْ مَلَكٌ : کہ میں کوئی فرشتہ ہوں

لِلَّذِيْنَ : ان کے لیے جن کو

اَعْيُنُكُمْ : تمہاری آنکھیں

خَيْرًا : کوئی بھلائی

اَللّٰہُ اَعۡلَمُ : اللہ خوب جاننے والا ہے
اِنِّیۡۤ اِذًا : (اگر میں یہ کہوں تو) بے شک میں پھر تو
قَالُوۡا یٰنُوۡحُ : ان لوگوں نے کہا: اے نوحؑ
فَاَکۡثَرۡتَ : پھر آپؑ نے کثرت کی
فَاۡتِنَا : تو (اب) آپؑ لے آئیں ہمارے پاس
اِنۡ کُنۡتَ : اگر آپؑ ہیں
قَالَ : انہوںؑ نے کہا
اِنۡ شَآءَ : اگر اُس نے چاہا
بِمُعۡجِزِیۡنَ : عاجز کرنے والے
نُصۡحِیۡۤ : میری خیر خواہی
اَنۡ اَنۡصَحَ : کہ میں خیر خواہی کروں
اِنۡ کَانَ اللّٰہُ : اگر (یعنی جبکہ) ہو اللہ
اَنۡ یُّغۡوِیَکُمۡ : کہ وہ گمراہ کرے تم کو
وَاِلَیۡہِ : اور اُس کی طرف ہی
اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ : یا یہ لوگ کہتے ہیں
قُلۡ : آپؐ کہہ دیجیے
فَعَلَیَّ : تو مجھ پر
وَاَنَا بَرِیۡٓءٌ : اور میں بَری ہوں
بِمَا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ : اُس کو جو اُن کے جیوں میں ہے
لَّمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ : یقیناً ظلم کرنے والوں میں سے ہوں
قَدۡ جٰدَلۡتَنَا : آپؑ بحث کر چکے ہم سے
جِدَالَنَا : ہم سے بحث کرنے میں
بِمَا تَعِدُنَاۤ : اس کو جس کا آپؑ وعدہ کرتے ہیں ہم سے
مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ : سچ کہنے والوں میں سے
اِنَّمَا یَاۡتِیۡکُمۡ بِہِ اللّٰہُ : لائے گا تمہارے پاس اللہ
وَمَاۤ اَنۡتُمۡ : اور تم لوگ نہیں ہو
وَلَا یَنۡفَعُکُمۡ : اور نفع نہیں دے گی تم کو
اِنۡ اَرَدۡتُّ : اگر میں ارادہ کروں
لَکُمۡ : تمہارے لیے
یُرِیۡدُ : (کہ) وہ ارادہ رکھتا ہو
ہُوَ رَبُّکُمۡ : وہ تمہارا ربّ ہے
تُرۡجَعُوۡنَ : تم لوگ لوٹائے جاؤ گے
اَفۡتَرٰىہُ : اس نے گھڑا اس کو (یعنی قرآن کو)
اِنِ افۡتَرَیۡتُہٗ : اگر میں گھڑتا ہوں اس کو
اِجۡرَامِیۡ : میرا جرم کرنا ہے
مِّمَّا تُجۡرِمُوۡنَ : اُس سے جو تم لوگ جرم کرتے ہو

نوٹ: آیت ۲۵ سے ۴۹ تک مسلسل حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہے۔ درمیان میں ایک آیت ۳۵ ایسی ہے جس کے متعلق دو رائے ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ آیت بھی اسی سلسلہ کلام کی ایک کڑی ہے۔ ایسی صورت میں اِفۡتَرٰىہُ کی ضمیر مفعولی حضرت نوح علیہ السلام کی نصیحت (نُصۡحِیۡۤ) کے لیے مانی جائے گی اور قُلۡ کا خطاب حضرت نوح علیہ السلام کے لیے ہوگا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ سلسلہ کلام کو منقطع کر کے مشرکین مکہ کے ایک اعتراض کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس کا جواب دینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ایسی صورت میں اِفۡتَرٰىہُ کی ضمیر مفعولی قرآن کے لیے مانی جائے گی اور قُلۡ کا خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہوگا۔ ترجمہ میں ہم نے دوسری رائے کو ترجیح دی ہے۔ اس دوسری رائے کی جو توجیہہ تفہیم القرآن میں دی گئی ہے، وہ یہ ہے:

''اندازِ کلام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کی زبان سے نوح علیہ السلام کا یہ قصہ سنتے ہوئے مخالفین نے اعتراض کیا ہوگا کہ محمد (ﷺ) یہ قصے بنا بنا کر اس لیے پیش کرتا ہے کہ انہیں ہم پر چسپاں کرے۔ جو چوٹیں وہ ہم پر براہِ راست نہیں کرنا چاہتا ان کے لیے ایک قصہ گھڑتا ہے اور اس طرح ''درحدیثِ دیگراں'' کے انداز میں ہم پر چوٹ کرتا ہے۔ لہٰذا سلسلہ کلام توڑ کر ان کے اعتراض کا جواب اسی فقرے میں دیا گیا ہے۔''

اس کے علاوہ ایک بات اور ہے۔ قرآن مجید میں قُلْ کا خطاب بالعموم رسول اللہ ﷺ کے لیے اور آپ کے توسط سے اُمّتِ مُسلمہ کے لیے آیا ہے۔ اس لیے اس مقام پر قُلْ کا خطاب حضرت نوح علیہ السلام کے لیے ماننا قرآن کے عمومی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔

آیات ۳۶ تا ۴۳

﴿وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَیَصْنَعُ الْفُلْكَ ۫ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَیْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَیَحِلُّ عَلَیْهِ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ﴿۳۹﴾ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ ﴿۴۰﴾ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِیْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۴۱﴾ وَهِیَ تَجْرِیْ بِهِمْ فِیْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَنَادٰی نُوْحُ ِۨ ابْنَهٗ وَكَانَ فِیْ مَعْزِلٍ یّٰبُنَیَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِیْۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَیْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ ﴿۴۳﴾﴾

ت ن ر

اس مادہ سے کوئی فعل استعمال نہیں ہوتا۔

تَنُّوْرُ (ج) تَنَانِیْرُ ۔ تَنُّور: زیرِ مطالعہ آیت ۴۰

ترجمہ:

وَاُوْحِیَ: اور وحی کی گئی	اِلٰی نُوْحٍ: نوحؑ کی طرف
اَنَّهٗ: کہ حقیقت یہ ہے کہ	لَنْ یُّؤْمِنَ: ہرگز ایمان نہیں لائیں گے
مِنْ قَوْمِكَ: آپؐ کی قوم میں سے	اِلَّا مَنْ: مگر وہ جو
قَدْ اٰمَنَ: ایمان لا چکے ہیں	فَلَا تَبْتَىِٕسْ: تو آپؐ دل برداشتہ مت ہوں

بِمَا: بسبب اس کے جو
وَاصْنَعِ الْفُلْكَ: اور آپؑ بنائیں کشتی
وَوَحْيِنَا: اور ہماری وحی (کی مطابقت) سے
فِي الَّذِيْنَ: ان (کے بارے) میں جنہوں نے
اِنَّهُمْ: بے شک وہ لوگ
وَيَصْنَعُ: اور (یعنی چنانچہ) وہ بنانے لگے
وَكُلَّمَا: اور جب کبھی
مَلَاٌ: کچھ سرداروں کا
سَخِرُوْا مِنْهُ: تو وہ مذاق کرتے انؑ سے
اِنْ تَسْخَرُوْا: اگر تم مذاق کرتے ہو
فَاِنَّا نَسْخَرُ: تو ہم مذاق کریں گے
كَمَا تَسْخَرُوْنَ: جیسے تم لوگ مذاق کرتے ہو
مَنْ يَّاْتِيْهِ: کون ہے' آئے گا جس کے پاس

وَيَحِلُّ عَلَيْهِ: اور اترے گا اس پر
حَتّٰٓى: یہاں تک کہ
اَمْرُنَا: ہمارا حکم
قُلْنَا: تو ہم نے کہا
مِنْ كُلٍّ: ہر ایک چیز میں سے
وَاَهْلَكَ: اور اپنے گھر والوں کو
سَبَقَ عَلَيْهِ: پہلے ہو چکا جس کے خلاف
وَمَنْ اٰمَنَ: اور اُس کو (بھی) جو ایمان لایا
مَعَهٗٓ: انؑ کے ساتھ
وَقَالَ: اور (اللہ نے) کہا
بِسْمِ اللّٰهِ: (اور کہو) اللہ کے نام سے ہے
وَمُرْسٰهَا: اور اس کو ٹھہرانے کا وقت
لَغَفُوْرٌ: یقیناً بے انتہا بخشنے والا ہے

كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ: یہ لوگ کرتے رہتے ہیں
بِاَعْيُنِنَا: ہماری آنکھوں (کے سامنے) سے
وَلَا تُخَاطِبْنِيْ: اور خطاب نہ کرنا مجھ سے
ظَلَمُوْٓا: ظلم کیا
مُّغْرَقُوْنَ: غرق کیے جانے والے ہیں
الْفُلْكَ: کشتی
مَرَّ عَلَيْهِ: گزر ہوتا انؑ پر
مِّنْ قَوْمِهٖ: انؑ کی قوم میں سے
قَالَ: تو وہؑ کہتے
مِنَّا: ہم سے
مِنْكُمْ: تم سے
فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ: تو عنقریب تم جان لوگے
عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ: ایک ایسا عذاب جو رسوا کرے گا اس کو
عَذَابٌ مُّقِيْمٌ: ایک قائم رہنے والا عذاب
اِذَا جَآءَ: جب آیا
وَفَارَ التَّنُّوْرُ: اور اُبل پڑا تنور
احْمِلْ فِيْهَا: آپؑ لاد لیں اس (کشتی) میں
زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ: دو جوڑوں کو
اِلَّا مَنْ: سوائے اُس کے
الْقَوْلُ: فیصلہ
وَمَآ اٰمَنَ: اور ایمان نہیں لائے
اِلَّا قَلِيْلٌ: مگر تھوڑے سے (لوگ)
ارْكَبُوْا فِيْهَا: تم سوار ہو جاؤ اس (کشتی) میں
مَجْرٖىهَا: اس کے بہنے کا وقت
اِنَّ رَبِّيْ: بے شک میرا ربّ
رَّحِيْمٌ: ہر حال میں رحم کرنے والا ہے

وَهِيَ : اور وہ	تَجْرِيْ بِهِمْ : بہتی تھی ان کے ساتھ
فِيْ مَوْجٍ : ایسی لہروں میں جو	كَالْجِبَالِ : پہاڑوں جیسی تھیں
وَنَادٰى : اور پکارا	نُوْحُ ِ ابْنَهٗ : نوحؑ نے اپنے بیٹے کو
وَكَانَ : اس حال میں کہ وہ تھا	فِيْ مَعْزِلٍ : ایک کنارے میں
يّٰبُنَيَّ : اے میرے بیٹے	ارْكَبْ مَّعَنَا : تُو سوار ہو جا ہمارے ساتھ
وَلَا تَكُنْ : اور تُو مت ہو	مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ : کافروں کے ساتھ
قَالَ سَاٰوِيْٓ : اُس نے کہا: میں جا لگوں گا	اِلٰى جَبَلٍ : کسی پہاڑ کی طرف
يَّعْصِمُنِيْ : وہ بچا لے گا مجھ کو	مِنَ الْمَآءِ : پانی سے
قَالَ : انہوںؑ نے کہا	لَا عَاصِمَ : کوئی بھی بچانے والا نہیں ہے
الْيَوْمَ : اس دن	مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ : اللہ کے فیصلے سے
اِلَّا مَنْ : مگر اُس کو جس پر	رَّحِمَ : اُس نے رحم کیا
وَحَالَ : اور حائل ہوئی	بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ : ان دونوں کے درمیان لہر
فَكَانَ : تو وہ ہو گیا	مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ : غرق کیے جانے والوں میں سے

نوٹ: مذکورہ واقعہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان دنیا کے ظاہر سے کس قدر دھوکا کھاتا ہے۔ جب حضرت نوح علیہ السلام دریا سے بہت دور خشکی پر اپنا جہاز بنا رہے ہوں گے تو لوگوں کو یہ ایک مضحکہ خیز فعل محسوس ہوتا ہوگا۔ وہ اسے حضرت نوح علیہ السلام کی خرابیٔ دماغ کا ایک ثبوت قرار دیتے ہوں گے۔ اور ایک ایک سے کہتے ہوں گے کہ اگر پہلے تمہیں اس شخص کے پاگل پن میں کچھ شبہ تھا تو اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ یہ کیا حرکت کر رہا ہے (اور خشکی پر بیٹھا جہاز بنا رہا ہے!) لیکن جو شخص حقیقت کا علم رکھتا تھا اسے ان لوگوں کی جہالت پر ہنسی آتی ہوگی کہ کتنے نادان ہیں یہ لوگ، میں انہیں خبردار کر چکا ہوں کہ ان کی شامت ان کے سر پر کھڑی ہے اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس سے بچنے کی تیاری کر رہا ہوں، مگر یہ مطمئن ہیں اور اُلٹا مجھے دیوانہ سمجھ رہے ہیں۔ اس معاملہ کو اگر پھیلا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا دنیا کے ظاہر و محسوس پہلو کے لحاظ سے عقلمندی اور بے وقوفی کا جو معیار قائم کیا جاتا ہے وہ اس معیار سے کس قدر مختلف ہوتا ہے جو علم حقیقت کے لحاظ سے قرار پاتا ہے۔ ظاہر بین آدمی جس کو دانشمندی سمجھتا ہے وہ حقیقت شناس آدمی کی نگاہ میں بے وقوفی ہوتی ہے اور ظاہر بین کے نزدیک جو چیز دیوانگی ہوتی ہے، حقیقت شناس کے لیے وہی عین عقلمندی ہوتی ہے۔ (تفہیم القرآن) ❁❁❁

میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

ظہار کا بیان

پروفیسر حافظ قاسم رضوان ☆

ظہار اور خلع میں مناسبت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک (عورت یا مرد کے) نشوز اور سرکشی کی بنا پر ہوتا ہے۔ خلع میں تحریم زیادہ ہے‘ اس لیے کہ خلع کی صورت میں نکاح ٹوٹ کر تحریم ثابت ہوتی ہے جبکہ ظہار میں نکاح باقی رہتے ہوئے حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔ اصطلاح شرع میں ظہار سے مراد یہ ہے کہ اپنی بیوی کو اپنی محرماتِ ابدیہ (ایسے رشتے جن سے کبھی بھی نکاح ممکن نہیں) ماں‘ بہن‘ بیٹی وغیرہ کے کسی ایسے عضو سے تشبیہہ دینا‘ جس کو دیکھنا اس کے لیے جائز نہیں‘ ماں کی پشت بھی اس کی ایک مثال ہے۔ زمانہ جاہلیت میں یہ لفظ دائمی حرمت کے لیے بولا جاتا تھا اور طلاق کے لفظ سے بھی زیادہ شدید سمجھا جاتا تھا۔ طلاق کی صورت میں رجعت یا نکاح جدید ہو کر مطلّقہ پھر بیوی بن سکتی ہے‘ لیکن ظہار کی صورت میں ان کے ہاں دوبارہ باہمی میاں بیوی بن کر رہنے کا قطعی کوئی راستہ نہ تھا۔ ظہار کے حوالے سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ۝۱ اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۲ وَالَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝۳ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ؕ فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًا ؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۴﴾ (المجادلہ)

’’(اے نبی ﷺ!) بے شک اللہ تعالیٰ نے اُس عورت کی بات سن لی جو اپنے شوہر کے معاملے میں آپ سے جھگڑ رہی تھی اور (اپنے رنج وغم کا) اللہ سے شکوہ کر رہی تھی‘ اور اللہ تعالیٰ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا‘ بے شک اللہ تعالیٰ (سب کچھ) سننے والا (اور) دیکھنے والا ہے۔ تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں (ہو جاتی) ہیں‘ ان کی مائیں تو بس وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے‘ اور بلاشبہ وہ ایک نامعقول اور جھوٹی بات کہتے ہیں‘ اور یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا معاف کرنے والا (اور) بخشنے والا ہے۔ اور جو لوگ

☆ ریٹائرڈ صدر شعبہ اسلامیات ومطالعہ پاکستان‘ گورنمنٹ کالج آف کامرس‘ علامہ اقبال ٹاؤن‘ لاہور

اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں' پھر اپنی کہی ہوئی بات کی تلافی کرنا چاہتے ہیں تو ان کے ذمے ایک غلام آزاد کرنا ہے' دونوں کے باہم اختلاط (ہمبستری) کرنے سے پہلے۔ اس کی تم کو نصیحت کی جاتی ہے' اور اللہ تعالیٰ تمہارے سارے اعمال سے پورا باخبر ہے۔ پھر جس کو غلام یا باندی میسّر نہ ہو تو اس کے ذمے لگاتار دو مہینے کے روزے ہیں قبل اس کے کہ وہ دونوں باہم مباشرت کریں' پھر جس سے یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کے ذمے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے' یہ (حکم) اس لیے (بیان کیا گیا ہے) کہ اللہ اور اس کے رسول پر تم ایمان لے آؤ' اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں' اور کافروں کے لیے سخت دردناک عذاب ہے۔''

سورۃ المجادلہ کی ان ابتدائی آیات کا شانِ نزول ایک خاص واقعہ ہے کہ حضرت اوس بن صامت ؓ نے ایک مرتبہ اپنی بیوی خولہ بنت ثعلبہ ؓ سے یہ کہہ دیا کہ اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّی (تُو میرے حق میں ایسی ہے جیسے کہ میری ماں کی پشت)۔ حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے یہ لفظ ابدی اور دائمی حرمت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ حضرت خولہؓ یہ واقعہ پیش آنے پر بہت پریشانی کی حالت میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں اس کا شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے حاضر ہوئیں۔ اُس وقت تک حضور ﷺ پر اس حوالے سے کوئی وحی نازل نہ ہوئی تھی' اس لیے آپؐ نے قولِ مشہور کے مطابق ان سے فرما دیا: مَا اَرَاکِ اِلَّا قَدْ حُرِّمْتِ عَلَیْہِ یعنی ''میری رائے میں تو تم اپنے شوہر پر حرام ہو گئیں''۔ یہ سن کر وہ واویلا اور فریاد کرنے لگیں کہ میری ساری جوانی تو اس شوہر کی خدمت میں لگ گئی' اب بڑھاپے میں انہوں نے مجھ سے یہ معاملہ کیا تو اب میں کہاں جاؤں؟ میرا اور میرے بچوں کا گزارا کیسے ہوگا؟ ایک روایت میں ہے کہ حضرت خولہؓ نے یہ بھی عرض کیا کہ مَا ذَکَرَ طَلَاقًا یعنی میرے شوہر نے تو طلاق کا نام بھی نہیں لیا! (پھر کیسے طلاق ہو گئی؟)

ایک دوسری روایت میں اس طرح آتا ہے کہ حضرت خولہؓ نے اللہ تعالیٰ سے فریاد کی: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَشْکُوْ اِلَیْکَ ''اے اللہ! میں اپنا شکوہ آپ کے سامنے پیش کرتی ہوں''۔ اسی طرح اس حوالے سے ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے خولہؓ سے یہ فرمایا: مَا اُمِرْتُ فِیْ شَاْنِکِ بِشَیْءٍ حَتّٰی الْآنَ یعنی ''ابھی تک تمہارے مسئلے کے بارے میں مجھ پر کوئی حکم نازل نہیں ہوا''۔ (ان سب روایات میں کوئی تضاد و تعارض نہیں' یہ سبھی اقوال صحیح ہو سکتے ہیں۔)

اس پس منظر میں ان ابتدائی چار آیات کا نزول ہوا۔ ان کی مختصر تشریح درج ذیل ہے:

آیت ۱: جن صحابیہ کا ذکر اس آیت میں ہے' وہ اوس بن صامت ؓ کی بیوی حضرت خولہ بنت ثعلبہ ؓ ہیں' ان کے شوہر نے ان سے ظہار کر لیا تھا اور وہ اس کی شکایت لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ عزّت بخشی کہ اس کے جواب میں قرآن کی یہ متعلقہ آیات نازل ہوئیں۔ ان میں صرف ظہار کا حکم شرعی اور اس کی تکلیف دور کرنے کا ہی انتظام نہیں فرمایا' بلکہ حضرت خولہ کی دلداری کے لیے شروع کلام میں ہی باری تعالیٰ نے فرما دیا کہ ہم اس عورت کی باتیں سن رہے تھے جو اپنے شوہر کے معاملے میں آپؐ سے مجادلہ کر رہی تھی۔ مجادلہ سے مراد وہ جھگڑا اور تکرار ہے جس میں ایک مرتبہ حضور ﷺ کے جواب دینے کے باوجود بار بار اپنی

تکلیف کو بیان کر کے آپؐ کو متوجہ کرنا ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جب حضور ﷺ نے ان کو یہ جواب دیا کہ تمہارے معاملے میں مجھ پر اللہ کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا تو اس پر ان غمزدہ کی زبان سے یہ نکلا کہ یوں تو آپؐ پر ہر چیز کے حکم نازل ہوتے رہتے ہیں‘ میرے بارے میں کیا ہوا کہ وحی بھی رک گئی؟ اور ذاتِ واحد سے فریاد شروع کی: ﴿وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ ’’پاک ہے وہ ذات جس کا سماع تمام آوازوں کو محیط ہے‘ ہر ایک کی آواز سنتا ہے‘ میں اُس وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود تھی جب خولہ بنت ثعلبہ اپنے شوہر کی شکایت بیان کر رہی تھی‘ مگر اتنے قریب ہونے کے باوجود مَیں ان کی بعض باتیں نہ سن سکی تھی‘ مگر حق تعالیٰ نے ان سب کو سنا اور فرمایا: ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ ۔۔۔۔﴾

دوم یہ اصلاح فرمائی گئی کہ اگر کوئی ناواقف جاہل یا احکامِ دین سے غافل آدمی ظہار کر ہی بیٹھے تو اس سے شریعت میں حرمتِ اَبدی ثابت نہیں ہوتی‘ لیکن اس کو کھلی چھٹی بھی نہیں دی جاسکتی کہ اس لفظ کے استعمال کے بعد بھی دوبارہ بیوی سے پہلے کی طرح اختلاط اور مباشرت کرتا رہے۔ اب اس پر کفّارے کا ایک جرمانہ لگایا گیا ہے‘ کہ ایسا شخص دوبارہ اپنی بیوی سے رجوع کرنا اور پہلے کی طرح انتفاع چاہتا ہے تو کفّارہ ادا کر کے اپنے اس گناہ کی تلافی کرے‘ بغیر کفّارہ ادا کیے بیوی اس کے لیے حلال نہ ہوگی۔

آیت ۲: ﴿اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ﴾ يُظٰهِرُوْنَ ظہار (بکسر ظاء) سے مشتق ہے‘ جو کہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے۔ بیوی کو اپنے اوپر حرام کر لینے کی ایک خاص صورت کے لیے بولا جاتا اور زمانہ اسلام کے پہلے سے رائج و معروف ہے۔ وہ صورت یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو یہ کہہ دے کہ اَنْتَ عَلَيَّ كَظَهْرِ اُمِّيْ (تو مجھ پر ایسی حرام ہے جیسے میری ماں کی پشت)‘ اس موقع پر پشت کا ذکر شاید بطور کنایہ کے ہے کہ اصل مراد تو بطن تھا‘ ذکر پشت کا کر دیا۔ اس آیت کے ذریعے اسلامی شریعت نے اس رسم بد کی اصلاح دو طرح سے کی‘ اوّل تو ظہار کو ہی ناجائز اور گناہ قرار دیا کہ جس کو بیوی سے علیحدگی اختیار کرنی ہے اس کا طریقہ طلاق ہے‘ ظہار کا استعمال اس کام کے لیے نہ کیا جائے‘ یہ بالکل ایک لغو اور جھوٹا کلام ہے کہ بیوی کو بمنزلہ ماں کہہ دیا جائے۔ ارشاد فرمایا: ﴿مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۭ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰۗيْ وَلَدْنَهُمْ ۭ﴾ یعنی ان کے اس بے ہودہ کلام کی وجہ سے بیوی ماں کا درجہ اختیار نہیں کر لیتی‘ ماں تو وہی ہے جس کے بطن سے کوئی پیدا ہوا ہو۔ پھر فرمایا: ﴿وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۭ﴾ یعنی ان کا یہ قول جھوٹ بھی ہے کہ بیوی کو خلافِ واقعہ ماں کہہ دیا اور منکر (گناہ) بھی ہے۔

آیت ۳‘۴: ﴿وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا﴾ اس کا متذکرہ بالا ہی مفہوم ہے۔ ﴿يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا﴾ میں حرفِ لام کو عَنْ کے معنی میں لیا گیا ہے‘ یعنی رجوع کرتے ہیں وہ اپنے قول سے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے يَعُوْدُوْنَ کی تفسیر بلفظ يَنْدَمُوْنَ بھی منقول ہے‘ اس کا مفہوم ہے کہ یہ قول کہنے کے بعد وہ اپنے کہنے پر نادم ہو جائیں اور دوبارہ بیوی سے اختلاط کرنا چاہیں۔

اس آیت سے اس بات کا بھی پتہ چلا کہ کفّارے کا وجوب بیوی کے ساتھ رجوع اور حلال ہونے کی غرض

سے ہے' بذاتِ خود ظہار اس کفّارہ کی علت نہیں۔ ظہار کرنا ایک گناہ ہے جس کا کفّارہ توبہ و استغفار ہے' اس طرف آیت کے آخر میں ﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۲﴾ سے اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص ظہار کر بیٹھے اور بیوی سے مزید کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تو اس پر کوئی کفّارہ لازم نہیں' البتہ بیوی کی حق تلفی ناجائز ہے۔ اگر وہ (عورت) مطالبہ کرے تو کفّارہ ادا کر کے اس سے اختلاط کرنا یا پھر طلاق دے کر اسے آزاد کرنا واجب ہے۔ اگر یہ شخص خود یہ کام نہ کرے تو اس کی بیوی حاکم (قاضی) کی عدالت میں دعویٰ (مقدمہ) کر کے بذریعہ عدالت شوہر کو مجبور کر سکتی ہے۔

کفّارۂ ظہار یہ ہے کہ ایسا شخص ایک غلام یا لونڈی آزاد کرے' اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو دو مہینے کے لگاتار مسلسل روزے رکھے' اور اگر کسی بیماری یا ضعف کے سبب اتنے روزے رکھنے پر بھی قدرت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلا دے۔ کھانا کھلانے کے قائم مقام یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو فی کس ایک فطرہ (فطرانہ) کی مقدار گندم یا اس کی قیمت دے دے۔ فطرہ کی مقدار ہمارے وزن کے اعتبار سے پونے دو کلو گرام ہے' (احتیاطاً دو کلو گندم یا اس کی قیمت بھی دی جا سکتی ہے)۔

مسند احمد میں ہے کہ حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا کی دہائی اور فریاد پر جب آیاتِ مذکورہ اور کفّارۂ ظہار کے احکام نازل ہوئے اور ان کی شوہر سے دائمی مفارقت اور حرمت سے بچنے کا راستہ نکل آیا' تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خولہؓ کے شوہر (حضرت اَوس بن صامتؓ) کو بلایا۔ وہ ایک کمزور بصارت والے بوڑھے آدمی تھے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو نازل شدہ آیات اور کفّارے کا حکم سنایا کہ ایک غلام یا لونڈی آزاد کر دو۔ انہوں نے عرض کی کہ یہ میری استطاعت نہیں کہ غلام یا لونڈی خرید کر آزاد کر دوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پھر دو مہینے کے مسلسل روزے رکھو۔ انہوں نے کہا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپؐ کو رسولِ برحق بنایا' میری حالت تو یہ ہے کہ اگر دن میں دو تین مرتبہ کھانا نہ کھاؤں تو میری نظر بالکل ہی جاتی رہتی ہے۔ ارشاد ہوا کہ پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو۔ انہوں نے عرض کی کہ اتنا بھی میری قدرت میں نہیں بجز اس کے کہ آپؐ ہی کچھ مدد کر دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو کچھ غلّہ عطا فرمایا' پھر دوسرے لوگوں نے کچھ جمع کر دیا۔ اس طرح ساٹھ مسکینوں کو فطرہ کی مقدار دے کر ان کا کفّارہ ادا ہو گیا۔

﴿ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ﴾ اس آیت میں ''لِتُؤْمِنُوْا'' فرمایا گیا اور یہاں ایمان سے مراد شرائع و احکامِ الٰہی پر عمل کرنا ہے۔ پھر ارشاد ہوا کہ یہ کفّارہ وغیرہ کے احکام اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں اور ان سے تجاوز کرنا حرام ہے۔ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اسلام نے نکاح' طلاق' ظہار اور دوسرے معاملات میں رسومِ جاہلیہ کو مٹا کر ان کی جگہ معتدل اور صحیح طریقوں کی تعلیم دی ہے' تم ان تعلیمات پر قائم رہو' اور جو لوگ ان حدودِ شرعیہ کے منکر اور کافر ہیں' ان کو آخرت میں لازماً دردناک سزا مل کر رہے گی۔ (۱)

کسی شخص کا اپنی زوجہ سے یہ کہہ دینا کہ تُو میرے لیے ایسی (حرام) ہے جیسی میری ماں کی پشت' ظہار کہلاتا

ہے۔ظہار' ظَہر (یعنی پیٹھ) سے مشتق ہے' لیکن فقہاء نے عورت کے بدن کے ہر اُس حصے کو جسے کھلا رکھنا حرام ہے' جیسے ران' پیٹ اور شرم گاہ وغیرہ' ظہار کے حکم میں شامل کر دیا ہے۔امام شافعیؒ کے نزدیک تو زوجہ کو اپنی ماں کے کسی حصۂ بدن سے بھی تشبیہہ دینا جو واجب الستر نہ ہو اور جسے دیکھنا جائز ہو (جیسے ہاتھ' آنکھ' پاؤں وغیرہ) ظہار کے حکم میں داخل ہے۔اسی طرح زوجہ کو اپنی دادی' نانی' بیٹی' خالہ' پھوپھی یا کسی ایسی عورت سے تشبیہہ دینا جس سے نکاح کرنا مستقل طور پر اس مرد کے لیے حرام ہے' موجب ظہار ہے۔اسی طرح اگر کسی نے اپنی بیوی کے کسی غیر معیّن حصے کو یا ایسے عضو کو جو کُل کے قائم مقام مانا جاتا ہے' تشبیہہ دی' تب بھی ظہار کا حکم جاری ہوگا' مثلاً یوں کہا کہ میرے لیے تیرا سر' تیرا چہرہ' تیری گردن' تیرا بدن' تیری جان' تیری شرم گاہ' تیرا آدھا بدن یا تیرا ایک تہائی بدن' میری ماں کی پشت (پیٹھ) کی طرح ہے' یہ سب ظہار میں شامل ہیں۔ان الفاظ میں بعض ایسے ہیں کہ ان کو بول کر پوری شخصیت مراد ہوتی ہے یا ایسے اجزائے بدن ہیں جو کہ غیر معیّن ہیں (جیسے تیرا آدھا بدن' تہائی بدن وغیرہ)' اس صورت میں حکم سارے جسم کی طرف متعدی ہے۔مذکورہ آیت میں مِنۡکُمۡ (تم میں سے) کا لفظ بتا رہا ہے کہ ذمّی کافروں کا ظہار کرنا درست نہیں۔امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک ہے۔ مِنۡ نِّسَآئِہِمۡ (اپنی عورتوں سے) کے لفظ سے پتہ چل رہا ہے کہ ظہار صرف اپنی منکوحہ سے ہی ہوتا ہے' باندی یا لونڈی سے نہیں ہوتا' خواہ اس سے پہلے قربت کی ہو یا نہ کی ہو۔جمہور صحابہ اور تابعین اسی کے قائل ہیں' امام ابوحنیفہؒ' امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔قولِ منکر' وہ بات جس کے جواز کا شریعت نے انکار کیا ہو۔زُور سے مراد ہے جھوٹ' غلط بات۔

﴿ثُمَّ یَعُوۡدُوۡنَ لِمَا قَالُوۡا﴾ (پھر اپنی کہی ہوئی بات سے رجوع کرتے ہیں)' اہلِ علم کے نزدیک اس کے مطلب میں اختلاف ہے۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ **عود** کرنے سے مراد پشیمان (نادم) ہونا ہے' یعنی اپنی کہی ہوئی بات پر پشیمان ہوتے ہیں اور حرمت کو دور کرنا چاہتے ہیں۔**عود** کا معنیٰ ہے کہ کسی چیز (یا کسی جگہ) سے چل کر پھر اسی کی طرف لوٹ آنا۔ظہار کرنے والوں کی بھی یہی حالت ہے۔پہلے عورت اُس کے لیے حلال تھی' پھر ظہار کیا تو حرام ہوگئی' پھر جب وہ اس (حرمت) پر پشیمان اور نادم ہوتا ہے تو اصل حِلّت کی طرف لوٹ آنا چاہتا ہے۔اکثر مفسّرین کے نزدیک یہاں آیت کا ظاہری معنی مراد نہیں' اس کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں۔بعض کا قول ہے کہ 'لِمَا قَالُوۡا' میں لام بمعنیٰ عَنۡ ہے' یعنی اپنے پہلے قول سے لوٹ آتے ہیں اور تحلیل کے طلب گار ہوتے ہیں۔بعض نے کہا کہ مضاف محذوف ہے' یعنی پچھلے (پہلے) قول کے تدارک اور تلافی کے لیے لوٹتے ہیں۔بیضاوی کے مطابق یہاں لام اِلٰی کا معنی دے رہا ہے' یعنی (وہ) اپنے قول کی تلافی کی طرف لوٹتے ہیں۔ان تمام تاویلات (توجیہات) پر **عود** کا مطلب ہوگا کہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونا' یعنی ناراضگی اور غصے کی حالت سے رضامندی کی حالت کی طرف لوٹتے ہیں اور عورت کی حِلّت کے خواستگار ہوتے ہیں۔فراء نے کہا کہ لام بمعنی فِیۡ ہے' عَادَ فُلَانٌ لِمَا قَالَ کے دو مطلب ہیں (کہ) فلاں شخص اپنی کہی ہوئی بات میں لوٹ آیا' یا کہی ہوئی بات کو توڑنے (اور اس کے خلاف کرنے) لگا۔ثعلب کا کہنا ہے کہ جس کو اپنے

لیے انہوں نے حرام کرلیا تھا' اس کو حلال کرنے کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ اس قول کے مطابق مضاف' محذوف ہوگا اور مَا قَالُوْا سے مراد ہوگی وہ بات جس سے ظہار کر کے انہوں نے اپنے لیے (عورت کی قربت کو) حرام کرلیا تھا' گو قول سے مراد ہوگی وہ بات جس کے لیے ظہار کا لفظ استعمال کیا تھا۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ﴾ (مریم:۸۰) یہاں يَقُوْلُ سے مراد کہنا نہیں ہے' بلکہ وہ مال مراد ہے جس کے متعلق وہ کہتا ہے۔ ابومسلم نے کہا کہ مقول منها سے عورت کو حرام سے حلال کر لینے اور اس کو (اپنے پاس) روک رکھنے کی طرف لوٹتے ہیں۔

اسلام سے پہلے دورِ جاہلیت میں ظہار سے بھی ویسی ہی حرمت پیدا ہو جاتی تھی جیسے کہ طلاق سے ہوتی ہے' لیکن اسلام نے دونوں میں فرق کر دیا کہ ظہار کو موجب حرمت تو ضرور مانا لیکن نکاح کو باقی رکھا' اور حرمتِ مباشرت کو دور کرنے کے لیے کفارے کا قانون بنا دیا۔ پس ظہار کے بعد سکوت اختیار کر لینا اور عورت کو آزاد نہ کرنا' اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ظہار کرنے والا اپنی بیوی کی قربت اور اس سے مباشرت کو حلال بنانا چاہتا ہے' لیکن اس کے لیے اسے کفارہ ادا کرنا واجب ہوگا۔ حسنؒ اور اس کے ساتھیوں کا قول ہے کہ ﴿يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا﴾ میں عَوْد سے مراد مباشرت ہے' لیکن ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا﴾ فرما کر اللہ تعالیٰ نے کفارہ کو حِلّت مباشرت کے لیے شرط بنا دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ يَعُوْدُوْنَ سے مراد مباشرت یعنی ارادۂ مباشرت اور قربت کی خواہش کا ہونا ہے' جیسے آیت ﴿اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ .....﴾ (المائدۃ:۶) میں بھی قیام سے مراد ارادۂ قیام ہے۔ پس یہ کہنا غلط ہوگا کہ عورت سے مباشرت سے پہلے کفارہ واجب نہیں ہوتا۔

﴿فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ﴾ یعنی ایک گردن (غلام یا لونڈی) آزاد کرنا' جوازِ مباشرت کے لیے شرط ہے۔ فَتَحْرِيْرُ میں اکثر مفسرین کے نزدیک ف سببیت کے لیے ہے' یعنی غلام کی آزادی کا سبب اس سے پہلے کا کلام ہے (ماقبل ف' مابعد ف کے لیے سبب ہے)۔ ف کو سببی قرار دینے کے بعد احناف کے نزدیک وجوبِ کفارہ کا سبب ظہار نہیں ہوسکتا۔ کفارہ ایک نوع کی عبادت ہے جبکہ ظہار محض بے ہودہ' جھوٹا' قبیح فعل اور ممنوع ہے' اب ممنوع عمل عبادت کا سبب نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے وجوبِ کفارہ کو دو باتوں یعنی ظہار اور رجوع سے وابستہ کیا ہے' اس لیے وجوبِ کفارہ کا سبب ان دونوں چیزوں کا مجموعہ ہوا۔ اکیلا ظہار تو گناہ ہے اور اس کے اندر سببِ عقوبت ہونے کی زیادہ صلاحیت ہے' اور رجوع یعنی شرعی قاعدے کے مطابق عورت کو روک رکھنا عبادت ہے' اس لیے وجوبِ کفارہ (حسب صراحت آیت) عقوبت اور عبادت کے درمیان دائرہ ہے۔ اب دونوں کا مجموعہ ہی وجوبِ کفارہ کا سبب ہوگا۔ 'محیط' میں ہے کہ کفارے کے وجوب کا سبب صرف رجوع ہے' کیونکہ کفارے سے پہلے دو باتوں اول ظہار اور پھر عود کا ذکر ہے۔ عود کا ذکر چونکہ ظہار کے بعد ہے' اس لیے کفارے کا حکم اس پر مرتب ہوگا اور ظہار کو شرط مانا جائے گا۔ سبب کا بسیط (یعنی مفرد ہونا) اصل ہے' اس لیے وجوبِ کفارہ کا سبب صرف رجوع کو مانا جائے گا۔ حکم تکرارِ شرط کی صورت میں مکرر ہو جاتا ہے' جیسے صدقۂ فطر مکرر ہوتا رہتا ہے اور اس کا سبب وجودِ افراد ہے۔ ظہار سے جو تحریم ہو جاتی ہے اس کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ادائے کفارہ کو سبب قرار دیا ہے اور

جوازِ مباشرت کے لیے شرط۔ جس طرح آیت قرآنی ﴿اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ﴾ میں وضو کو جوازِ صلوٰۃ (نماز) کی شرط اور طہارت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ ظہار کرنے والے (مظاہر) کی کفارے کی ادائیگی کے بغیر زوجہ سے مباشرت بھی حرام ہے اور وہ مبادی اور اسباب بھی حرام ہیں جو مباشرت تک پہنچا دیتے ہیں' جیسے بوسہ اور معانقہ وغیرہ۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا یہی مسلک ہے' امام احمدؒ کا آخری قول بھی حرمت کا ہے۔ ذٰلِکُمْ یعنی مباشرت سے پہلے کفارہ ادا کرنے کا حکم۔ تُوْعَظُوْنَ بِہٖ تم کو اس کی نصیحت کی جاتی ہے تاکہ ظہار سے جو حرمت پیدا ہوگئی ہے وہ زائل ہو جائے۔ یا یہ کہ تم دوبارہ ظہار کا ارتکاب اس ڈر سے نہ کرو کہ بیوی سے علیحدہ ہونا پڑے گا' یا یہ کہ کفارے کا وجوب اس لیے ہوا ہے کہ تم نے ارتکابِ گناہ کیا ہے' اس خیال سے تم نصیحت حاصل کرو اور ظہار کے عمل سے آئندہ باز رہو۔

﴿فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَھْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ط﴾ ''پھر جس کو (غلام یا باندی) میسّر نہ ہو تو اس کے ذمے لگاتار دو مہینے کے روزے ہیں' قبل اس کے کہ دونوں (زوجین) باہم اختلاط کریں۔'' فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ یعنی جس کے پاس غلام یا لونڈی موجود نہ ہو اور وہ اسے حاصل بھی نہ کر سکتا ہو' خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ غلام خریدنے کی قیمت میسّر نہ ہو' یا قیمت تو موجود ہو اور غلام نہ دستیاب ہو' یا غلام کی جتنی قیمت ہو اتنا ہی ظہار کرنے والا مقروض ہو' اپنے اور اہل وعیال کے مصارف کے لیے ضرورت مند ہو کہ اگر غلام خریدتا ہے تو اہل وعیال کے نفقہ سے معذور ہو جاتا ہے' ان تمام صورتوں میں امام ابوحنیفہ' امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک غلام یا لونڈی آزاد نہ کرنا اور روزے رکھنا جائز ہے۔ اسی طرح اگر باندی یا غلام موجود تو ہو لیکن مالک خود خدمت لینے کا محتاج ہو (جیسے لولا' لنگڑا' نابینا' زیادہ کمزور یا بیمار) تو غلام یا لونڈی آزاد نہ کرنا اور روزے رکھنا امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک جائز ہے' جس طرح پانی صرف بقدر پیاس ہو اور زیادہ نہ ہو تو بے وضو کو تیمم کرنا جائز ہے۔ امام مالک اور امام شافعی (ایک قول کے مطابق) کے نزدیک ادائے کفارہ کے وقت کی ہی فراخ دستی یا تنگ دستی معتبر ہے۔ فَصِیَامُ شَھْرَیْنِ ان دو (قمری) ماہ کے روزوں میں ماہِ رمضان' یوم فطر' یوم نحر اور ایامِ تشریق نہ آنے چاہئیں' کیونکہ رمضان کے روزے تو اللہ کی طرف سے واجب (فرض) ہیں اور ایامِ ممنوعہ میں روزہ رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ مُتَتَابِعَیْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ط اگر روزوں کا تسلسل ٹوٹ جائے' خواہ کسی عذر کی وجہ سے ہو یا بغیر عذر کے' از سرِ نو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنے لازم ہوں گے' اس پر علماء کا اجماع ہے۔ اگر ظہار کرنے والے نے دو مہینے کے دوران رات کو قصداً یا بھول کر مباشرت کر لی تو امام شافعیؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک از سرِ نو دوبارہ روزے رکھنا لازم نہیں' کیونکہ تسلسل ختم نہیں ہوا۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک نئے سرے سے کُل روزے رکھنے ہوں گے' کیونکہ مباشرت سے پہلے روزے رکھنا لازم ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ روزے رکھنے کے دوران مباشرت نہ کی جائے' ایک قول امام احمدؒ کا بھی یہی ہے۔

﴿فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْکِیْنًا ط﴾ ''پھر جو یہ بھی نہ کر پائے تو اس کے ذمے ساٹھ

مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے‘‘۔ اگر بیماری یا بڑھاپے کی بنا پر وہ روزے بھی نہ رکھ سکے‘ تو اس صورت میں ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا لازم ہے۔ حضرت عمر اور حضرت علی ؓ کے قول کے مطابق ہر مسکین کو نصف صاع (دو کلو) غلہ (کسی بھی قسم کا ہو) دیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر مسکین کو نصف صاع گندم یا ایک صاع جَو یا چھوہارے دیے جائیں گے۔ شعبی‘ نخعی‘ سعید بن جبیر‘ حاکم‘ مجاہد اور کرخی کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالکؒ کے ہاں ایک مُد ہر ایک کو‘ اور امام احمدؒ کے نزدیک گندم یا اس کا آٹا ایک مُد یا دو مُد چھوہارے یا جَو دیے جائیں گے۔ امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ (کے دور) کے مُد کے برابر وہ غلہ دیا جائے جو (اس) شہر میں زیادہ کھایا جاتا ہو۔ خیال رہے کہ غلے کی بجائے اس کی قیمت بھی دی جاسکتی ہے اور ایک مسکین کو بھی ساٹھ دن کھانا کھلایا جاسکتا ہے۔ یہاں مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ط کی شرط یہ واضح کرنے کے لیے ہے کہ کفّارہ ادا کرنے سے پہلے مباشرت حرام ہے۔ تیسرے نمبر (یعنی حکم اطعام) کے بعد مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ط صرف اس وجہ سے ذکر نہیں کیا گیا کہ نمبر ایک اور دو میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ نمبر تین صورت میں بھی یہ شرط لازم ہے‘ تیسری جگہ ذکر کرنے سے کلام بے فائدہ طویل ہو جاتا۔ اس دلیل کی روشنی میں کفّارے کی دوسری صورت میں بھی یہ شرط مذکور نہ ہوتی تو پھر یہ گمان ہو سکتا تھا کہ یہ شرط صرف غلام یا باندی آزاد کرنے کے ساتھ مخصوص ہے‘ دوسری اور تیسری صورت کے کفّارے کے لیے اس کی ضرورت نہیں‘ اب ایسا گمان نہیں کیا جاسکتا۔

احادیث کی روشنی میں اگر ظہار کرنے والا کفّارہ دینے سے پہلے مباشرت کر بیٹھے تو پھر استغفار کرے‘ کیونکہ یہ عمل ناجائز اور امر حرام ہے‘ جس کے ارتکاب کے بعد توبہ و استغفار ضروری ہے۔ اس کے بعد کفّارۂ ظہار ادا کر دے تاکہ آئندہ کے لیے حرمتِ مباشرت زائل ہو جائے۔ امام مالک نے اپنی موطا میں ایسے شخص کے بارے میں جو ظہار کرنے کے بعد کفّارہ ادا کرنے سے پہلے مرتکب مباشرت ہو جائے‘ فرمایا ہے کہ یہ شخص کفّارہ ادا کرنے تک آئندہ مباشرت نہ کرے اور مذکورہ فعل کے لیے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے۔ امام مالک کا کہنا ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ میں نے سنا ہے‘ اس میں سب سے بہتر صورت یہی ہے۔

﴿ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ط وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ط وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۴﴾

’’یہ (حکم) اس لیے (بیان کیا گیا ہے) کہ اللہ اور اس کے رسول پر تم ایمان لے آؤ‘ اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں‘ اور کافروں کے لیے سخت دردناک عذاب ہو گا‘‘۔ ذٰلِكَ کا معنی ہے یہ بیان کردہ احکام۔ لِتُؤْمِنُوْا میں ایمان سے مراد احکامِ شرعیہ پر عمل ہے‘ جس طرح آیت قرآنی: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ط﴾ (البقرۃ:۱۴۳) ’’اور اللہ تعالیٰ تمہارا ایمان ضائع نہ کرے گا‘‘ میں ایمان سے مراد نماز ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ احکام اس لیے دیے ہیں کہ تم ان پر عمل پیرا ہو جاؤ اور جاہلیت کے دستور و رواج کو بالکل چھوڑ دو۔ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ط اور یہ کفّارے اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ بندشیں ہیں۔ جو لوگ ان کے مامور ہیں وہ ظہار جیسے ممنوعات کے ارتکاب سے باز رہتے ہیں۔ یا یہ مفہوم ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود ہیں اور

ان سے تجاوز کرنا قطعاً جائز نہیں۔ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴﴾ ایسے لوگوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ کے احکامات کو قبول نہیں کرتے اور ان پر عمل پیرا نہیں ہوتے‘ ممنوعات کے ارتکاب سے باز نہیں رہتے اور اللہ کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کرتے رہتے ہیں‘ رسوا کن اور دردناک عذاب ہے۔(۲)

ظہار کے حوالے سے عرب میں اکثر و بیشتر یہ صورت پیش آتی کہ زوجین کی باہمی لڑائی میں شوہر غصے میں آ کر یہ کہتا: ’اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ‘ اس کے لغوی معنی تو یہ ہیں کہ تو میرے اوپر ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ‘ لیکن اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ تجھ سے مباشرت کرنا میرے لیے ایسا ہے جیسا کہ میں اپنی ماں سے مباشرت کروں۔ اِس زمانے میں بھی بہت سے ناسمجھ لوگ بیوی سے لڑ کر اس کو اپنی ماں‘ بہن اور بیٹی سے تشبیہہ دے بیٹھتے ہیں‘ جس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ شوہر اب اُس عورت کو بیوی نہیں بلکہ ان عورتوں کی طرح سمجھتا ہے جو کہ اس کے لیے مستقل حرام ہیں‘ اسی فعل کا نام ظِہار ہے۔ عربی زبان میں ظَھر استعارے کے طور پر سواری کے لیے بولا جاتا ہے‘ جیسے سواری کے جانور کو ظَھر کہتے ہیں‘ کیونکہ اس کی پیٹھ پر آدمی سوار ہوتا ہے۔ چونکہ اُس دور کے لوگ بیوی کو اپنے اوپر حرام کرنے کے لیے کہتے تھے کہ تجھے ظَھر بنانا میرے اوپر ایسا حرام ہے جیسے اپنی ماں کو ظَھر بنانا‘ اس لیے یہ کلمات زبان سے نکالنا ان کی اصطلاح میں ظہار کہلاتا تھا۔ ایامِ جاہلیت میں اہل عرب کے ہاں ظہار نہ صرف طلاق‘ بلکہ اس سے بڑھ کر بہت شدید قطع تعلق کا اعلان سمجھا جاتا تھا۔ ان کے نزدیک اس کا مفہوم یہ تھا کہ شوہر اپنی بیوی سے صرف ازدواجی رشتہ ہی نہیں توڑ رہا‘ بلکہ اسے ماں کی طرح ہمیشہ کے لیے اپنے اوپر حرام قرار دے رہا ہے۔ اسی بنا پر ان کے نزدیک طلاق کے بعد تو رجوع کی گنجائش ہو سکتی تھی‘ مگر ظہار کرنے کے بعد رجوع کا قطعاً کوئی امکان باقی نہیں رہتا تھا۔ ظہار کے حکم کو اس سے متعلقہ تناظر میں سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ظہار سے متعلقہ وہ واقعات نگاہ میں رہیں جو عہدِ رسالت میں پیش آئے۔

شریعت میں ظہار کا مفصل قانون سورۃ المجادلۃ کی متذکرہ بالا آیات اور ان فیصلوں سے ماخوذ ہے جو ان آیات کے نزول کے بعد پیش آمدہ واقعات میں حضور اکرم ﷺ نے صادر فرمائے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق اسلام میں ظہار کا پہلا واقعہ حضرت اوس رضی اللہ عنہ بن صامت انصاری کا ہے‘ جن کی اہلیہ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کی فریاد پر اللہ تعالیٰ نے متعلقہ آیات نازل فرمائیں۔ محدثین نے اس واقعہ کی جو تفصیلات متعدد راویوں سے نقل کی ہیں‘ ان میں فروعی اختلافات تو بہت ہیں مگر قانونی اہمیت رکھنے والے ضروری اجزاء میں تقریباً اتفاق ہے۔ ان روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت اوس رضی اللہ عنہ بڑھاپے کی بنا پر کچھ چڑچڑے بھی ہو گئے تھے اور بعض روایات کی رو سے ان کے اندر کچھ جنون کی سی لٹک بھی پیدا ہو گئی تھی‘ جس کے لیے راویوں نے ’کَانَ بِہٖ لَمَمٌ‘ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ (لمم عربی میں دیوانگی کو نہیں کہتے بلکہ اس طرح کی ایک کیفیت کو کہتے ہیں جسے ہم اردو زبان میں غصے سے پاگل ہو جانے کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔) اس حال میں وہ پہلے بھی متعدد مرتبہ اپنی زوجہ سے ظہار کر چکے تھے‘ لیکن حالت اسلام میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ بیوی سے لڑ کر ان سے پھر یہ فعل صادر ہو گیا۔ اس پر ان کی زوجہ

حضرت خولہؓ نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ بیان کیا' اور عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرے اور میری بچیوں کو تباہی سے بچانے کے لیے رخصت کا کوئی پہلو نکل سکتا ہے؟ اس پر حضورِ اقدس ﷺ نے جواب میں جو کچھ کہا' وہ مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ بعض روایات کے الفاظ یہ ہیں کہ ''ابھی تک اس مسئلے میں مجھے کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے' اور بعض میں یہ الفاظ ہیں کہ'' میرا خیال ہے کہ تم اس (خاوند) پر حرام ہو گئی ہو''۔ اور بعض میں یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ''تم اس پر حرام ہو گئی ہو' یہ جواب سن کر وہ نالہ وفریاد کرنے لگیں' کئی بار انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ انہوں نے طلاق کے الفاظ تو نہیں کہے تھے' آپ ﷺ کوئی ایسی صورت بتائیں کہ جس سے مَیں' میرے بچے اور میرے بوڑھے شوہر کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے' مگر ہر مرتبہ آنحضرت ﷺ انہیں مندرجہ بالا جواب ہی دیتے رہے۔ اتنے میں آپ ﷺ پر نزولِ وحی کی کیفیت طاری ہوئی اور متذکرہ بالا (متعلقہ) آیات کا نزول ہوا۔ اور پھر حضور ﷺ نے حضرت اوس بن صامتؓ کو بلا کر ان سے متعلقہ حکم پر عمل کروایا۔ (مسند احمد' ابوداؤد)۔

ظہار کا دوسرا واقعہ حضرت سلمہ بن صخر بیاضیؓ سے متعلق ہے۔ ان پر شہوت کا غلبہ اعتدال سے بڑھ کر تھا۔ رمضان المبارک آیا تو انہوں نے اس خیال سے کہ کہیں ماہِ رمضان میں بے قابو نہ ہو جائیں' روزوں کے اختتام تک بیوی سے ظہار کر لیا' مگر وہ اپنے قول پر قائم نہ رہ سکے اور ایک رات بیوی کے کسی عضو پر نظر پڑنے سے بے اختیار مباشرت کر بیٹھے۔ پھر نادم ہو کر حضرت سلمہؓ حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور سارا ماجرا عرض کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک غلام آزاد کر دو۔ انہوں نے عرض کی کہ میرے پاس اپنی بیوی کے سوا کوئی اور نہیں کہ جسے آزاد کر دوں۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ مسلسل دو مہینے کے روزے رکھو۔ انہوں نے عرض کیا کہ روزوں میں صبر نہ کرنے کی بنا پر ہی یہ مصیبت مجھ پر آئی ہے' تو حضور ﷺ نے انہیں ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا ارشاد فرمایا۔ حضرت سلمہؓ نے عرض کیا کہ ہم تو اتنے نادار ہیں کہ رات کھانا کھائے بغیر سوئے ہیں۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے ان کو بنی زریق کے محصل زکوٰۃ سے اتنا سامانِ خوراک دلوایا کہ ساٹھ مسکینوں میں بانٹ بھی دیں اور کچھ اپنے بال بچوں کی ضرورت کے لیے بھی رکھ لیں۔ (ترمذی مسند احمد)

ایک تیسرا واقعہ نام کی تصریح کے بغیر یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے ظہار کیا اور پھر اس کا کفّارہ ادا کرنے سے پہلے ہی اپنی زوجہ سے ہمبستری کر لی۔ اس کے بعد حضور ﷺ سے مسئلہ پوچھا تو آپؐ نے حکم دیا کہ اپنی زوجہ سے الگ رہو' جب تک کہ کفّارہ ادا نہ کر دو۔ (ترمذی' نسائی)

چوتھا واقعہ یہ ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے سنا کہ ایک شخص اپنی اہلیہ کو بہن کہہ کر پکار رہا ہے۔ اس پر آپؐ نے اسے غصے سے فرمایا: ''(کیا) یہ تیری بہن ہے؟'' (مراد یہ کہ تیری زوجہ قطعاً تیری بہن نہیں ہو سکتی!) مگر حضور ﷺ نے اس شخص کی اس حرکت کو ظہار قرار نہیں دیا۔ (ابوداؤد)

یہ چار معتبر واقعات ہیں جو مستند راویوں سے ظہار سے متعلق احادیث میں ملتے ہیں۔

فقہائے کرام نے متذکرہ بالا آیات کے الفاظ' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات' نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلوں اور اسلام کے اصولِ عامہ سے ظہار کے مسئلے پر جو قانون اخذ کیا ہے' اُس کے عمومی نکات درج ذیل ہے:

(۱) قانونِ ظہار عرب جاہلیت کے اس رواج کو منسوخ کرتا ہے جس کی رو سے یہ فعل نہ صرف نکاح کے رشتے کو توڑ دیتا تھا' بلکہ وہ عورت اپنے شوہر کے لیے مستقل طور پر حرام ہو جاتی تھی۔ اس طرح یہ قانون ان تمام ضابطوں اور رواجوں کو بھی منسوخ کرتا ہے جو ظہار کے فعل کو بے اثر اور بے معنی سمجھتے ہوں اور یہ بات روا رکھتے ہوں کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو ماں یا دوسرے محرمات کے ساتھ تشبیہ دے کر بھی اس کے ساتھ حسبِ سابق زن وشو والا تعلق جاری رکھے۔ اسلام کی نگاہ میں ماں اور دوسرے محرمات کی حرمت کوئی ایسی معمولی چیز نہیں کہ ایک انسان ان کے اور بیوی کے درمیان مشابہت کا خیال بھی کرے' کجا کہ اس کو زبان پر لائے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان قانون اسلامی نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ تین بنیادوں پر قائم ہے۔ اوّل کہ ظہار سے نکاح نہیں ٹوٹتا بلکہ عورت بدستور شوہر کی بیوی رہتی ہے۔ دوم کہ ظہار سے عورت وقتی طور پر شوہر کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ سوم کہ یہ حرمت اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک شوہر ظہار کا کفّارہ نہ ادا کر دے اور صرف کفّارہ ہی اس حرمت کو ختم کر سکتا ہے۔

(۲) مظاہر (ظہار کرنے والا شخص) کے بارے میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ اس شوہر کا ظہار معتبر ہے جو عاقل و بالغ ہو اور بقائمی ہوش وحواس ظہار کے الفاظ زبان سے ادا کرے۔ بچے اور مجنون کا ظہار غیر معتبر ہے۔ نیز ایسے شخص کا ظہار بھی معتبر نہیں جو اس سے متعلقہ الفاظ کو ادا کرتے وقت اپنے ہوش وحواس میں نہ ہو' مثلاً سوتے میں بڑبڑائے یا کسی قسم کی بے ہوشی وغیرہ میں مبتلا ہو گیا ہو۔

(۳) کیا مرد کی طرح عورت بھی ظہار کر سکتی ہے؟ مثلاً اگر وہ شوہر سے یہ کہے کہ تُو میرے لیے میرے باپ کی طرح ہے یا میں تیرے لیے تیری ماں کی طرح ہوں' تو کیا یہ بھی ظہار ہو گا؟ ائمہ اربعہ کا کہنا ہے کہ یہ ظہار نہیں ہے اور نہ ہی اس پر ظہار کے قانونی احکامات کا اطلاق ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں صریحاً یہ احکام صرف اس صورت کے لیے بیان کیے گئے ہیں جبکہ شوہر اپنی بیویوں سے ظہار کریں ﴿اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕهِمْ﴾۔ ظہار کرنے کا اختیار بھی اسی کو حاصل ہے جو طلاق دینے کا اختیار رکھتا ہے۔

(۴) ظہار کے واضح الفاظ جو عاقل و بالغ شخص بحالت ہوش وحواس اپنی زبان سے ادا کرے' اس کے بعد اس کا یہ عذر قابلِ قبول نہیں ہو سکتا کہ اس نے غصے میں' مذاق میں یا پیار میں ایسا کہا' یا کہ اس کی نیت ظہار کی نہ تھی۔ البتہ جو الفاظ اس حوالے سے واضح اور صریح نہیں یا جن میں مختلف معنوں کا احتمال ہے' ان کا حکم الفاظ کی نوعیت پر منحصر ہے۔

(۵) اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ظہار اس عورت سے کیا جا سکتا ہے جو کہ آدمی کے نکاح میں ہو' البتہ اس امر پر اختلاف ہے کہ کیا غیر منکوحہ سے بھی ظہار ہو سکتا ہے؟ اس مسئلے پر مختلف مسالک ہیں۔ حنفیہ کا قول ہے کہ اگر غیر منکوحہ عورت سے آدمی یہ کہے کہ مَیں تجھ سے نکاح کروں تو میرے اوپر تُو میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے' اب جب بھی وہ اس سے نکاح کرے گا تو کفّارہ ادا کیے بغیر اس کے نزدیک نہ جا سکے گا۔

حضرت عمرؓ کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ ان کے زمانے میں ایک شخص نے مندرجہ بالا بات ایک عورت سے کہی اور بعد میں اس سے نکاح کر لیا تو حضرت عمرؓ نے اسے کفّارۂ ظہار ادا کرنے کو کہا۔ مالکیہ اور حنبلیہ کا بھی یہی موقف ہے‘ البتہ وہ اس پر اس بات کا اضافہ کرتے ہیں کہ اگر کسی عورت کی تخصیص نہ کی گئی ہو اور کہنے والے نے یوں کہا ہو کہ تمام عورتیں میرے لیے ماں کی پیٹھ کی جیسی ہیں‘ تو جس سے بھی اب وہ نکاح کرے گا‘ اس کو ہاتھ لگانے سے پہلے اسے کفّارۂ ظہار دینا ہوگا۔ حضرات سعید بن مسیب‘ عروہ بن زبیر‘ عطاء بن ابی رباح‘ اسحاق بن راہویہ اور حسن بصری رحمہم اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ شافعیہ کا کہنا ہے کہ ظہار نکاح سے پہلے کرنا بالکل بے معنی اور بے اثر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور قتادہؒ کا بھی یہی قول ہے۔

(۶) کیا ظہار ایک خاص وقت یا مدّت کے لیے ہو سکتا ہے؟ اس باب میں احناف اور شوافع کا کہنا ہے کہ اگر ایک آدمی نے کسی خاص وقت یا مدّت کا تعین کر کے ظہار کیا ہو تو جب تک وہ وقت پورا نہیں ہو پاتا‘ بیوی کو ہاتھ لگانے اور قرب کرنے سے کفّارہ لازم آئے گا اور مدّت گزر جانے پر ظہار غیر مؤثر ہو جائے گا۔ اس کی دلیل حضرت سلمہؓ بن صخر کا واقعہ ہے جس میں انہوں نے صرف مدّتِ رمضان کے لیے اپنی بیوی سے ظہار کیا تھا‘ پھر اس پر قائم نہ رہ سکے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر کفّارہ دینا پڑا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں یہ نہیں فرمایا تھا کہ یہ وقت اور مدّت کا تعیّن بے معنی بات ہے۔ امام مالکؒ کا اس حوالے سے اختلاف ہے اور وہ وقت / مدّت کی تخصیص کو غیر مؤثر مانتے ہیں۔

(۷) اگر اہلیہ سے مشروط ظہار کیا گیا ہے تو جب بھی شرط کی خلاف ورزی ہوگی‘ کفّارۂ ظہار لازم آئے گا۔ مثلاً کوئی آدمی اپنی بیوی سے یہ کہے کہ اگر میں گھر میں آؤں تو میرے اوپر تُو ایسی ہے جیسی میری ماں کی پشت‘ اس صورت میں وہ جب بھی گھر میں داخل ہوگا‘ کفّارہ ادا کیے بغیر بیوی کو ہاتھ نہ لگا سکے گا۔

(۸) اگر ایک بیوی سے متعدد مرتبہ ظہار کے الفاظ استعمال کیے گئے ہوں‘ تو احناف اور شوافع کا کہنا ہے کہ خواہ ایک ہی نشست میں ایسا کیا گیا ہو یا کئی نشستوں میں‘ جتنی مرتبہ بھی یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہوں‘ اتنے ہی کفارے لازم آئیں گے۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ کہنے والے نے ایک دفعہ الفاظ استعمال کرنے کے بعد اپنے قول کی تکرار محض اپنے پہلے الفاظ کی تاکید کے لیے کی ہو‘ اس صورت میں ایک ہی کفّارہ واجب الادا ہوگا۔ امام مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ کا مسلک ہے کہ خواہ کتنی مرتبہ ظہار کے الفاظ کی تکرار کی گئی ہو‘ قطع نظر اس کے کہ کہنے والے کی اعادہ کی نیت ہے یا تائید کی‘ کفّارہ اس پر ایک ہی لازم ہوگا۔ حضرات شعبی‘ طاؤس‘ عطاء بن ابی رباح‘ حسن بصری اور اوزاعی رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

(۹) کفّارۂ ظہار ادا کرنے سے پہلے اگر خاوند اپنی بیوی سے مباشرت کر بیٹھا ہو تو ائمہ اربعہ کے نزدیک اگرچہ یہ گناہ ہے‘ آدمی کو اس پر استغفار کرنا چاہیے اور دوبارہ ہرگز اس کا اعادہ نہ کرے‘ مگر کفّارہ اُسے ایک ہی دینا ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں جن لوگوں سے یہ فعل سرزد ہوا‘ ان سے آپؐ نے یہ تو فرمایا تھا کہ اس پر استغفار کرو اور اس وقت تک بیوی سے علیحدہ رہو (ہمبستری نہ کرو) جب تک اس کا کفّارہ ادا نہ کر دو‘ مگر آپ نے کفّارۂ ظہار

کے علاوہ ایسے لوگوں کو کوئی اور کفّارہ ادا کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

(۱۰) ایک ظہار کا کفّارہ ادا کرنے کے بعد اگر آدمی دوبارہ الفاظِ ظہار استعمال کر بیٹھے، تو پھر یہ حکم متفق علیہ ہے کہ دوبارہ کفّارہ ادا کیے بغیر بیوی اس کے لیے حلال نہ ہو پائے گی۔

(۱۱) بیوی کو کس سے تشبیہہ دینا ظہار ہے؟ اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

(ا) احناف کے نزدیک اس حکم میں وہ تمام عورتیں داخل ہیں جو نسب یا رضاعت یا ازدواجی رشتہ کی بنا پر آدمی کے لیے ہمیشہ کے لیے حرام ہیں۔ مگر جو عورتیں وقتی طور پر حرام ہوں اور کسی وقت بھی حلال ہو سکتی ہوں، وہ اس حکم میں داخل نہیں ہیں، جیسے بیوی کی بہن، اس کی خالہ، اس کی پھوپھی یا کوئی غیر عورت جو آدمی کے نکاح میں نہ ہو۔ ابدی محرمات میں سے کسی عورت کو کسی ایسے عضو کے ساتھ تشبیہہ دینا جس پر نظر ڈالنا آدمی کے لیے حلال نہ ہو، ظہار ہوگا۔

(ب) شوافع کہتے ہیں کہ اس حکم میں صرف وہی عورتیں داخل ہیں جو ہمیشہ حرام تھیں اور ہمیشہ حرام رہیں گی، یعنی ماں، بہن، بیٹی وغیرہ۔ مگر وہ عورتیں اس میں داخل نہیں ہیں جو کبھی حلال رہ چکی ہوں، جیسے رضاعی ماں بہن، ساس، بہو وغیرہ، یا کسی وقت حلال ہو سکتی ہوں، جیسے سالی وغیرہ۔ اور عارضی یا وقتی حرام عورتوں کے علاوہ ابدی حرمت رکھنے والی عورتوں میں سے کسی کے ان اعضاء کے ساتھ بیوی کو تشبیہ دینا ظہار ہوگا جن کا ذکر بغرضِ اظہارِ اکرام و توقیر عادتاً نہیں کیا جاتا۔

(ج) مالکیہ کا کہنا ہے کہ ہر عورت جو آدمی کے لیے حرام ہو، اس سے بیوی کو تشبیہہ دینا ظہار ہے، حتیٰ کہ بیوی سے یہ کہنا بھی ظہار کے ضمن میں آتا ہے کہ تُو میرے لیے فلاں غیر عورت کی پیٹھ جیسی ہے۔ نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ماں اور ابدی محرمات کے کسی عضو سے بیوی کو یا اس کے کسی عضو کو تشبیہہ دینا ظہار ہے۔

(د) حنابلہ ظہار کے حکم میں ان تمام عورتوں کو داخل سمجھتے ہیں جو ابداً حرام ہوں، خواہ وہ پہلے کبھی حلال رہ چکی ہوں، مثلاً ساس یا دودھ پلانے والی (رضاعی) ماں۔ رہی وہ عورتیں جو بعد میں کسی وقت حلال ہو سکتی ہوں، جیسے سالی، تو ان کے معاملے میں امام احمد بن حنبلؒ کا ایک قول یہ ہے کہ ان سے تشبیہہ دینا بھی ظہار ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان سے تشبیہہ دینا ظہار نہیں۔

(۱۲) اس امر میں تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ بیوی سے یہ کہنا کہ تُو میرے لیے میری ماں کی پیٹھ جیسی ہے، صریحاً ظہار ہے، کیونکہ اہلِ عرب میں یہی ظہار کا طریقہ تھا اور قرآن کریم کا حکم اسی کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ البتہ اس بات میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ دوسرے الفاظ میں سے کون سے ایسے لفظ ہیں جو واضح طور پر ظہار کے حکم میں ہیں اور کون سے ایسے الفاظ ہیں جن سے ظہار کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ قائل (کہنے والے) کی نیت سے کیا جائے گا۔

(ا) احناف کے نزدیک ظہار کے صریح الفاظ وہ ہیں جن میں صاف طور پر حلال عورت (بیوی) کو حرام عورت

(یعنی محرماتِ ابدیہ میں سے کسی عورت) سے تشبیہ دی گئی ہو' یا اس کے کسی ایسے عضو سے تشبیہ دی گئی ہو جس پر نظر ڈالنا حلال نہیں ہے' جیسے یہ کہنا کہ تُو میرے اوپر ماں یا فلاں (حرام) عورت کے پیٹ یا ران جیسی ہے' ان کے سوا دوسرے الفاظ میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ اگر کوئی یوں کہے کہ تُو میرے اوپر حرام ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ' تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ صریح ظہار ہے' لیکن امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اگر ظہار کی نیت ہو تو ظہار ہے اور طلاق کی نیت ہو تو طلاق ہے۔ اگر یوں کہے کہ ''تُو میری ماں جیسی ہے یا میری ماں کی طرح ہے'' تو حنفیہ کا عمومی فتویٰ یہ ہے کہ یہ ظہار کی نیت سے ظہار ہے' طلاق کی نیت سے طلاقِ بائن' اور اگر کوئی نیت نہ ہو تو یہ سخت بے ہودہ بات ہے جس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے غصے کا اظہار فرمایا تھا مگر اسے ظہار نہیں قرار دیا۔

(ب) شوافع کے ہاں ظہار کے صریح الفاظ یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہے کہ تُو میرے نزدیک' یا میرے ساتھ' یا میرے لیے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ' یا تُو میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے' یا تیرا بدن یا تیرا نفس میرے لیے میری ماں کے جسم یا بدن یا نفس کی طرح ہے۔ ان کے سوا باقی تمام الفاظ میں قائل کی نیت سے فیصلہ ہوگا۔

(ج) حنابلہ کے نزدیک ہر وہ لفظ جس سے کسی شخص نے بیوی کو یا اس کے مستقل اعضاء میں سے کسی عضو کو کسی ایسی عورت سے جو اس کے لیے حرام ہے' یا اس کے مستقل اعضاء میں سے کسی عضو سے صاف اور واضح تشبیہ دی لائے ہو' ظہار کے معاملہ میں صریح مانا جائے گا۔

مالکیہ کا مسلک بھی قریب قریب یہی ہے' البتہ تفصیلات میں ان کے فتاویٰ الگ الگ ہیں۔ مثلاً کسی آدمی کا بیوی سے یہ کہنا کہ ''تُو میرے لیے میری ماں جیسی ہے یا میری ماں کی طرح ہے'' یہ اگر ظہار کی نیت سے ہو تو ظہار ہے' طلاق کی نیت سے ہو تو طلاق' اور کوئی نیت نہ ہو تو ظہار ہے۔ یہ کہنا کہ ''تُو میرے اوپر ایسی حرام ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ'' مالکیہ اور حنابلہ دونوں کے نزدیک یہ ظہار ہے' خواہ طلاق کی نیت سے یہ الفاظ کہے گئے ہوں یا نیت کچھ بھی نہ ہو۔

الفاظِ ظہار کی بحث میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ فقہاء نے اس حوالے سے جتنی بحثیں کی ہیں' وہ سب عربی زبان کے الفاظ اور محاورات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ دنیا کی دوسری زبانیں بولنے والے نہ عربی زبان میں ظہار کریں گے اور نہ ہی ظہار کرتے وقت عربی الفاظ اور فقروں کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ اپنی زبان میں ادا کریں گے۔ اس لیے کسی لفظ یا فقرے کے متعلق اگر یہ فیصلہ کرنا ہو کہ وہ ظہار کی تعریف میں آتا ہے یا نہیں' تو اسے اس لحاظ سے نہیں جانچنا چاہیے کہ وہ فقہاء کے بیان کردہ الفاظ میں سے کس کا صحیح ترجمہ ہے' بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا قائل نے بیوی کو جنسی (sexual) تعلق کے لحاظ سے محرمات میں سے کسی کے ساتھ صاف صاف تشبیہ دی ہے' یا اس کے الفاظ میں کچھ دوسرے مفہومات کا بھی احتمال ہے۔ اس کی نمایاں مثال خود وہ فقرہ ہے جس کے متعلق تمام فقہاء اور مفسرین کا اتفاق ہے کہ عرب میں ظہار کے لیے وہی بولا جاتا تھا اور قرآن کریم کا حکم اسی کے بارے میں نازل ہوا ہے' یعنی أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّي (تُو میرے لیے میری ماں کی پیٹھ جیسی ہے)۔

غالباً دنیا کی کسی زبان میں اور اردو کی حد تک تو ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اس زبان میں ظہار کرنے والا ایسے الفاظ نہیں استعمال کرسکتا‘ جو اس عربی فقرے کا لفظی ترجمہ ہوں۔ البتہ وہ اپنی زبان کے ایسے الفاظ ضرور استعمال کرسکتا ہے جن کا مفہوم ٹھیک وہی ہو جسے ادا کرنے کے لیے ایک عرب یہ فقرہ بولا کرتا تھا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ ’تجھ سے مباشرت میرے لیے ایسی ہے جیسے اپنی ماں سے مباشرت‘ یا جیسے بعض جہلاء اپنی بیوی سے کہہ بیٹھتے ہیں کہ ’’تیرے پاس آؤں گویا اپنی ماں کے پاس جاؤں۔‘‘

(۱۳) قرآن پاک میں جس چیز کو کفّارہ لازم ہونے کا سبب قرار دیا گیا ہے وہ محض ظہار نہیں بلکہ ظہار کے بعد **عَوْد** ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص صرف ظہار کر کے رہ جائے اور **عود** نہ کرے تو اس پر کفّارہ لازم نہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ **عود** کیا ہے جو کفّارہ کا موجب ہے‘ اس بارے میں فقہاء کے مختلف مسالک ہیں:

(ا) بقول احناف **عود** سے مراد مباشرت کا ارادہ ہے‘ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ محض ارادے اور خواہش پر کفّارہ لازم ہو جائے‘ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس حرمت کو دور کرنا چاہے جو اُس نے ظہار کر کے بیوی کے ساتھ تعلق زن وشو کے معاملے میں اپنے اوپر عائد کر لی تھی‘ تو وہ پہلے کفّارہ دے‘ اس کے بغیر یہ حرمت دور نہیں ہوسکتی۔

(ب) امام مالکؒ کے اس بارے میں تین قول ہیں‘ مگر مالکیہ کے ہاں ان کا مشہور اور صحیح ترین قول اسی مسلک کے مطابق ہے جو اوپر احناف کا بیان ہوا ہے۔

(ج) امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک بھی ابن قدامہؒ نے قریب قریب وہی نقل کیا ہے جو اوپر دونوں اماموں کا بیان ہوا ہے‘ ان کا کہنا ہے کہ ظہار کے بعد مباشرت کے حلال ہونے کے لیے کفّارہ شرط ہے۔

(د) امام شافعیؒ کا مسلک ان تینوں ائمہ سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کا اپنی بیوی سے ظہار کرنے کے بعد اسے حسبِ سابق بیوی بنائے رکھنا اور اسے بیوی کی حیثیت سے روکے رکھنا **عود** ہے‘ کیونکہ جس وقت اُس نے ظہار کیا اسی وقت اس نے گویا اپنے اوپر یہ بات حرام کر لی کہ اسے بحیثیت بیوی کے رکھے۔ لہٰذا اگر اس نے ظہار کرتے ہی فوراً اپنی زوجہ کو طلاق نہ دی اور اسے اتنی دیر تک روکے رکھا جس میں وہ طلاق کے الفاظ زبان سے نکال سکتا تھا‘ تو اب اس نے **عود** کر لیا اور اس پر کفّارہ واجب ہو گیا۔

(۱۴) قرآن کریم کا حکم ہے کہ ظہار کرنے والا کفّارہ دے‘ اس سے پہلے کہ زوجین ایک دوسرے کو ’مس‘ کریں۔ ائمہ اربعہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہاں مَس سے مراد چھونا ہے‘ اس لیے کفّارہ ادا کرنے سے پہلے صرف مباشرت ہی حرام نہیں بلکہ شوہر (کسی طرح سے بھی) بیوی کو چھو نہیں سکتا۔ حنابلہ ہر قسم کے تلذّذ کو حرام قرار دیتے ہیں‘ شافعیہ شہوت کے ساتھ چھونے کو حرام کہتے ہیں اور مالکیہ لذّت کے ساتھ بیوی کے جسم پر نظر ڈالنے کو بھی ناجائز ٹھہراتے ہیں‘ البتہ ان کے نزدیک صرف چہرے اور ہاتھوں پر نظر ڈالنا اس سے مستثنیٰ ہے۔

(۱۵) ظہار کے بعد اگر کوئی بیوی کو طلاق دے دے تو طلاقِ رجعی ہونے کی صورت میں رجوع کر کے بھی وہ کفّارہ

ادا کیے بغیر اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اور بائن ہونے کی صورت میں اگر زوجہ سے دوبارہ نکاح کرے‘ تب بھی اسے ہاتھ لگانے سے پہلے کفّارہ ادا کرنا لازم ہوگا۔ حتیٰ کہ وہ اگر تین طلاق دے چکا ہو اور اُس کی عورت دوسرے آدمی سے نکاح کرنے کے بعد بیوہ یا مطلّقہ ہو چکی ہو اور ظہار کرنے والا پہلا شوہر اُس سے دوبارہ از سرِ نو نکاح کرے‘ اس سب کے باوجود کفّارہ کی ادائیگی کے بغیر وہ اُس کے لیے حلال نہ ہوگی‘ اس نکتہ پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔

(۱۶) عورت کے لیے لازم ہے کہ جس شوہر نے اُس کے ساتھ ظہار کیا ہے‘ اسے ہاتھ نہ لگانے دے جب تک کہ وہ کفّارہ ادا نہ کر لے۔ چونکہ تعلق زن و شوہر عورت کا حق ہے اور ظہار کر کے شوہر نے اُسے اس حق سے محروم کیا ہے‘ اس لیے اب اگر خاوند کفّارہ نہ دے تو بیوی عدالت سے رجوع کر سکتی ہے۔ عدالت شوہر کو مجبور کرے گی کہ وہ کفّارہ دے کر حرمت کی وہ رکاوٹ ختم کرے جو اُس نے اپنے اور اپنی بیوی کے درمیان کھڑی کر لی ہے۔ اور اگر وہ نہ مانے تو عدالت اسے ضرب یا قید یا پھر دونوں سزائیں دے سکتی ہے۔ یہ حکم بھی مسالک اربعہ میں متفق علیہ ہے۔

(۱۷) قرآن وسُنّت میں واضح بیان ہے کہ ظہار کا پہلا کفّارہ غلام آزاد کرنا ہے۔ یہ کسی کے لیے ممکن نہ ہو تو وہ دو مہینے کے روزوں کی صورت میں کفّارہ ادا کر سکتا ہے‘ اور اگر اس سے بھی قاصر ہو تو اسے ساٹھ مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلانا ہوگا۔ اب کوئی شخص بالفرض کفارے کی ان تینوں اقسام سے عاجز ہو‘ تو چونکہ شریعت میں کفارے کی کوئی اور شکل نہیں رکھی گئی‘ اس لیے اسے اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک وہ ان میں سے کسی ایک قسم کے کفارے پر قادر نہ ہو جائے۔ البتہ سُنّت سے یہ ثابت ہے کہ ایسے شخص کی مدد کرنی چاہیے تاکہ وہ تیسری قسم کا کفّارہ ادا کر سکے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بیت المال سے ایسے لوگوں کی مدد فرمائی ہے جو اپنی غلطی سے اس مشکل (ظہار) میں پھنس گئے اور تینوں اقسام کے کفارے سے عاجز تھے۔

(۱۸) قرآن کریم ظہار کے کفّارہ میں ’رَقَبَۃ‘ آزاد کرنے کا حکم دیتا ہے‘ جس کا اطلاق غلام اور لونڈی دونوں پر ہوتا ہے اور اس میں عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ شیر خوار بچہ بھی اگر غلامی کی حالت میں ہو تو اسے آزاد کر دینا ظہار کے کفارے کے لیے کافی ہے۔ البتہ فقہاء کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا مومن اور کافر دونوں قسم کے غلام آزاد کیے جا سکتے ہیں یا صرف مومن غلام ہی آزاد کرنا ہوگا۔ حنفیہ اور ظاہریہ کا موقف ہے کہ غلام کا آزاد کر دینا ہی کفّارہ کے لیے کافی ہے‘ خواہ مومن ہو یا کافر‘ اس لیے کہ قرآن شریف میں مطلق رَقبۃ کا ذکر ہے‘ مؤمن کی قید نہیں لگائی گئی۔ اس کے برخلاف شافعیہ‘ مالکیہ اور حنابلہ غلام کے ساتھ مؤمن کی شرط لگاتے ہیں‘ اس لیے کہ انہوں نے اس حکم کو ان دوسرے کفاروں پر قیاس کیا ہے جن میں رقبۃ کے ساتھ قرآن کریم میں مؤمن کی پابندی بھی لگائی گئی ہے۔

(۱۹) غلام نہ ہونے کی صورت میں قرآن مجید کا حکم ہے کہ کفارۂ ظہار کے لیے مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے جائیں‘ اس سے قبل کہ زوجین ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ اس حکم خداوندی پر عمل کرنے کی مختلف مسالک میں تفصیلات درج ذیل ہیں:

(ا) اس امر پر تو اتفاق ہے کہ مہینوں سے مراد قمری مہینے ہیں۔ اگر طلوعِ قمر سے روزوں کا آغاز کیا جائے تو دو مہینے

پورے کرنے ہوں گے۔ اگر درمیان میں کسی تاریخ سے شروع کیا جائے تو حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ ساٹھ روزے پورے کرنے چاہئیں۔ شافعیہ کے نزدیک پہلے اور تیسرے مہینے میں مجموعی طور پر تیس روزے رکھے جائیں اور درمیان والا قمری مہینہ خواہ انتیس کا ہو یا تیس کا' اس پورے مہینے کے روزے رکھ لینے کافی ہیں۔

(ب) احناف اور شوافع کا کہنا ہے کہ روزوں کی ابتداء ایسے وقت کرنی چاہیے کہ درمیان میں رمضان المبارک' عیدین' یوم النحر اور ایام تشریق نہ آئیں' کیونکہ ان کی وجہ سے کفارے کے روزے چھوڑنے سے دو ماہ کا تسلسل ٹوٹ جائے گا اور نئے سرے سے روزے رکھنے پڑیں گے۔ حنابلہ کے مطابق درمیان میں رمضان کے روزے رکھنے اور حرام دنوں کے نہ رکھنے سے تسلسل نہیں ٹوٹے گا' بس ساٹھ روزے پورے کرنا ہوں گے۔

(ج) دو ماہ کے دوران خواہ آدمی کسی عذر کی بنا پر روزے چھوڑے یا بلا عذر' دونوں صورتوں میں احناف اور شوافع کے نزدیک تسلسل ٹوٹ جائے گا' اور نئے سرے سے روزے رکھنے ہوں گے۔ یہی رائے امام باقر' ابراہیم نخعی' سعید بن جبیر اور سفیان ثوری کی ہے۔ امام مالک اور امام احمد کے نزدیک مرض یا سفر کے عذر کی وجہ سے بیچ میں روزہ چھوڑا جا سکتا ہے اور اس سے تسلسل نہیں ٹوٹتا' البتہ بلا عذر روزہ چھوڑنے سے تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ کفارے کے روزے رمضان المبارک کے فرض روزوں سے زیادہ موکد اور اہم نہیں' جب ان کو شرعی عذر کی بنا پر چھوڑا جا سکتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ کفارہ ظہار کے روزوں کو اسی بنا پر نہ چھوڑا جا سکے۔ یہی قول حضرت عبداللہ بن عباسؓ' حسن بصری' عطاء بن ابی رباح' سعید بن مسیب' عمر وبن دینار' شعبی' طاؤس' مجاہد' اسحاق بن راہویہ' ابوعبید اور ابوثور کا ہے۔

(د) دو مہینوں کے روزوں کے دوران اگر روزے رکھنے والا اس بیوی سے مباشرت کر بیٹھے جس سے اس نے ظہار کر رکھا ہو' تو تمام ائمہ فقہ کے نزدیک اس سے تسلسل ٹوٹ جائے گا اور کفارہ ادا کرنے والے کو از سر نو روزے رکھنے ہوں گے' کیونکہ ہاتھ لگانے سے پہلے دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۲۰) قرآن وسنّت کے مطابق ظہار کا تیسرا کفّارہ (۶۰ مساکین کا کھانا) وہ شخص ہی دے سکتا ہے جو دوسرے کفارے (دو قمری مہینوں کے مسلسل روزوں) کی قدرت نہ رکھتا ہو۔ اس کفارے پر عمل درآمد کے لیے فقہاء نے جو تفصیلی احکام مرتب کیے ہیں' وہ درج ذیل ہیں:

(ا) ائمہ اربعہ کے نزدیک روزے رکھنے پر قادر نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یا تو بڑھاپے یا پھر کسی مستقل بیماری کی وجہ سے آدمی کی لگاتار روزے رکھنے کی طاقت نہ ہو' بیماری بڑھنے کا غالب اندیشہ ہو' یا مسلسل دو ماہ مباشرت سے پرہیز کرنا اس کی طاقت اور ہمت سے باہر ہو' اور اسے یہ اندیشہ ہو کہ اس دوران وہ کہیں بے صبری کا مظاہرہ نہ کر بیٹھے۔ ان تینوں مجبوریوں کا صحیح ہونا ان احادیث سے ثابت ہے جو حضرت اوس بن صامت انصاریؓ اور حضرت سلمہ بن صخر بیاضیؓ کے معاملے میں روایت ہوئی ہیں۔

(ب) کھانا صرف ان مساکین کو ہی دیا جا سکتا ہے جن کا نفقہ کفّارہ ادا کرنے والے کے ذمہ واجب نہ ہوتا ہو۔

(ج) حنفیہ کے نزدیک مسلمان اور ذمی دونوں قسم کے مساکین کو کھانا دیا جاسکتا ہے' البتہ حربی اور مُستامِن کُفّار کو نہیں دیا جاسکتا۔ شافعیہ' مالکیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ کھانا صرف مسلمان مساکین کو ہی دیا جاسکتا ہے۔

(د) یہ تو متفق علیہ ہے کہ کھانا دینے سے مراد دو وقت کا پیٹ بھر کر کھانا دینا ہوتا ہے' البتہ کھانا دینے کی تعبیر میں اختلاف ہے۔ حنفیہ کے نزدیک دو وقت کے پیٹ بھرنے کے مطابق غلہ دے دینا یا کھانا پکا کر دو وقت کھانا کھلا دینا' دونوں صحیح ہیں' کیونکہ قرآن کریم میں **اطعام** کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی خوراک دینے کے بھی ہیں اور کھلانے کے بھی۔ مگر شافعیہ' مالکیہ اور حنابلہ پکا کر کھلانے کو صحیح نہیں سمجھتے' بلکہ دوسرے کو غلّہ دے دینا ہی ضروری قرار دیتے ہیں۔ غلہ دینے کی صورت میں البتہ یہ امر متفق علیہ ہے کہ غلّہ وہ دینا چاہیے جو اس شہر یا علاقے کے لوگوں کی روز مرہ کی غذا ہو' اور سب مسکینوں کو برابر کا دینا چاہیے۔

(ہ) احناف کے نزدیک اگر ایک ہی مسکین کو ساٹھ دن تک کھانا دیا جائے تو یہ بھی صحیح ہے' البتہ یہ صحیح نہیں کہ ایک ہی دن اسے ساٹھ دنوں کی اکٹھی خوراک دے دی جائے۔ لیکن شافعی' مالکی اور حنبلی مسالک ایک ہی مسکین کو خوراک دینے کے خلاف ہیں' ان کے نزدیک ساٹھ مسکینوں کو دینا ہی ضروری ہے۔ یہ بات بھی چاروں مسالک میں جائز نہیں کہ ساٹھ آدمیوں کو ایک وقت کی خوراک اور ان سے الگ دوسرے ساٹھ آدمیوں کو دوسرے وقت کی خوراک دی جائے۔

(و) ائمہ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک یہ صحیح نہیں کہ کوئی شخص تیس دن کے روزے رکھے اور تیس مسکینوں کو کھانا کھلائے' دو کفارے اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ روزے رکھنے ہیں تو پورے دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنے ہوں گے اور اگر کھانا کھلانا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلایا جائے گا۔

(ز) اگرچہ قرآن کریم میں کفّارۂ طعام کے متعلق یہ الفاظ استعمال نہیں کیے گئے کہ یہ کفارہ بھی زوجین کے ایک دوسرے کو چھونے سے پہلے ادا ہونا چاہیے' لیکن فحوائے کلام اس کا مقتضی ہے کہ اس تیسرے کفّارے پر بھی اس قید کا اطلاق ہوگا۔ اسی لیے ائمہ اربعہ نے اس کو جائز نہیں رکھا کہ کفّارۂ طعام کے دوران میں آدمی بیوی سے ہمبستری کرے۔

اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے ''اَنْتِ عَلَیَّ کَاُمِّی'' یا ''اَنتِ عَلَیَّ مِثْلُ اُمِّی'' (تُو مجھ پر میری ماں کی مانند ہے' یا تُو مجھ پر میری ماں کی مثل ہے) کہا اور اس کی پشت کا ذکر نہیں کیا' تو اس شخص کی نیت دریافت کی جائے گی اور اس کے مطابق ہی حکم ہوگا' احناف اور شوافع کا یہی مسلک ہے۔ نیت اس لیے معلوم کی جائے گی کہ اس کا کلام تشبیہ کی چند صورتوں کا احتمال رکھتا ہے' پس کسی ایسی صورت کو متعین کرنے کے لیے نیت کا واضح ہونا ضروری ہے۔ اگر اس شخص نے کہا کہ میرا تو ارادہ یہ تھا کہ تُو (زوجہ) مستحق اکرام ہونے میں میرے نزدیک میری ماں کی مانند ہے' تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے کہا' یعنی کلام کو اس کی نیت پر محمول کیا جائے گا۔ اس لیے کہ اپنی ماں کے ساتھ کسی کو تعظیم و اعزاز میں تشبیہ دینا بکثرتِ کلام میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اگر اس شخص کی ظہار کی نیت ہوگی تو اسے بھی غلط نہیں کہا جاسکتا' کیونکہ جب پورے ماں کے جسم سے تشبیہ دی تو بعض اعضاء سے بھی تشبیہ ہو

جائے گی‘ کُل بول کر کئی مرتبہ جزء مراد ہوسکتا ہے‘ لیکن صراحت نہ ہونے کی بنا پر نیت کا واضح ہونا لازمی ہے۔ اگر اس سے اس نے طلاق کی نیت کی ہوگی تو کلام میں لفظ کنایہ ہونے کی وجہ سے طلاق بائن ہو جائے گی‘ اس کی مراد اس وقت یہ ہوگی کہ تو میرے لیے بمنزلہ میری ماں کے حرام ہے‘ اور اگر اس کی کچھ بھی نیت نہ ہو تو پھر یہ کلام لغو (بے مقصد‘ فضول) سمجھا جائے گا اور کچھ اثر نہ ہوگا۔ (۳)

آخر میں ظہار سے متعلقہ چند مسائل پیش خدمت ہیں:

(ا) کوئی شخص اپنی زوجہ کو بیٹا کہہ کر پکارتا ہے اور وہ جواب دیتی ہے‘ دوسرے لوگ بھی اس سے زوجہ کے بارے میں ’تمہارا بیٹا‘ کہہ کر پوچھتے ہیں۔ ایسی صورت میں بیوی کو بیٹا کہنا ایک لغو اور بے ہودہ حرکت ہے‘ مگر یہ ظہار نہیں‘ اور نکاح قائم ہے۔

(ب) کوئی بیوی اپنے شوہر کو کہے کہ اگر تم میرے قریب آئے (ازدواجی تعلق قائم کیا) تو تم اپنی ماں بہن کے قریب آؤ گے‘ تو یہ بالکل بے ہودہ اور غلط الفاظ ہیں‘ البتہ نکاح پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ لیکن ان ناشائستہ الفاظ کی بنا پر بیوی گناہ کی مرتکب ہوئی ہے اور اسے ان الفاظ سے توبہ کرنی چاہیے۔

(ج) ایک خاوند نے محلے کے کچھ آدمیوں کو بلا کر ان کے سامنے اپنی بیوی کو کہا کہ ’’آئندہ سے تمہارا اور میرا رشتہ ماں‘ بہن کا ہے‘‘ اور یہ الفاظ اس نے دو تین مرتبہ کہے اور عورت سے تعلق ختم کر لیا۔ اب یہ کہنا کہ ’’تمہارا اور میرا رشتہ ماں‘ بہن کا ہے‘‘ ظہار کے الفاظ ہیں۔ ان الفاظ سے طلاق تو نہیں ہوئی‘ البتہ شوہر کو ازدواجی تعلق قائم کرنے سے پہلے کفارۂ ظہار دینا ہوگا‘ اور یہ کفارہ ادا کیے بغیر بیوی سے مباشرت کرنا حرام ہے۔ (۴)

حواشی

(۱) معارف القرآن از مفتی محمد شفیع‘ سورۃ المجادلۃ‘ آیات ۱ تا ۴‘ ص ۳۳۲ تا ۳۳۷‘ جلد ۸‘ طبع ۱۹۹۰ء‘ ادارۃ المعارف‘ کراچی

(۲) تفسیر مظہری از قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی‘ مترجم مولانا سید ابوالدائم جلالی‘ سورۃ المجادلۃ‘ آیات ۱ تا ۴‘ ص ۳۴۴ تا ۳۴۸‘ جلد ۱۲‘ طبع ۱۹۸۰ء‘ ایچ ایم سعید کمپنی‘ کراچی

(۳) (i) تفسیر مظہری از قاضی ثناء اللہ پانی پتی‘ مترجم مولانا سید عبدالدائم‘ سورۃ المجادلۃ‘ آیات ۱ تا ۴‘ جلد ۱۲‘ طبع ۱۹۸۰ء‘ ایچ ایم سعید کمپنی‘ کراچی

(ii) کتاب النکاح و کتاب الطلاق از علامہ ابن رشد‘ مترجم ساجد الرحمن صدیقی‘ کتاب الطلاق (ظہار کا بیان)‘ ص ۱۸۹ تا ۱۹۰ طبع ۲۰۱۴ء‘ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ‘ لاہور

(iii) اشرف الہدایہ‘ شرح (اردو) ہدایہ از مولانا جمیل احمد‘ جلد ۵‘ باب الظہار‘ ص ۱۱۱‘ ۱۳۱ تا ۱۳۳‘ طبع ۲۰۰۶‘ مکتبہ دارالاشاعت کراچی

(۴) آپ کے مسائل اور ان کا حل از مولانا محمد یوسف لدھیانوی‘ جلد ۵‘ ص ۳۹۶ تا ۳۹۷‘ طبع ۱۹۹۸ء‘ مکتبہ لدھیانوی‘ بنوری ٹاؤن‘ کراچی

❀❀❀

مباحثِ عقیدہ (۳)

مؤمن محمود

ہم نے امام بیہقی علیہ الرحمہ کی کتاب الاعتقاد والھدایۃ الی سبیل الرشاد کے دوسرے باب کی ابتدا کی تھی۔ وہ باب اس عنوان کے تحت ہے کہ ان باتوں کا بیان کہ جن کے ذریعے استدلال قائم کیا جاتا ہے کہ یہ عالم حادث ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کے محدث ہیں‘ اس کے پیدا کرنے والے ہیں۔ اور وہ قدیم‘ واحد اور لاشریک لہ ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور لاشبیہ لہ ہے کہ اس کا کوئی شبیہہ نہیں ہے‘ اس کے مانند کوئی نہیں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ...لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ اس میں ہم نے دیکھا کہ جو نظر ہے‘ غور وفکر ہے اس کی حاجت کیا ہے؟ تو اس میں ہمارے سامنے دو موقف آئے۔ ایک نکتہ نظر یہ تھا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جو معرفت ہے وہ بدیہی ہے‘ وہ تو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ ﴿اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (ابراہیم:۱۰) اللہ کے بارے میں شک نہیں ہوسکتا۔ اور پھر ہم نے وہ حدیث بھی دیکھی کہ ((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ)) ہر مولود فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

خدا کی معرفت قطعی ہے مگر بدیہی نہیں

ہمارے علماء کلام یعنی علماء عقیدہ کی اکثریت کہتی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا وجود اور معرفت اگرچہ قطعی تو ہے‘ یقینی ہے‘ لیکن بدیہی نہیں ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر انسان غور وفکر سے کام لے گا اور صحیح دلائل کو پہچان لے گا تو اللہ کی یقینی معرفت یعنی اللہ کے وجود کی یقینی معرفت اسے حاصل ہو جائے گی۔ اس معرفت میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہوگا‘ لیکن یہ معرفت ایسی نہیں ہے کہ بغیر استدلال‘ بغیر دلیل‘ بغیر نبی کو دیکھے‘ بغیر وحی کی معرفت کے حاصل ہو جائے۔ چنانچہ ہے تو قطعی‘ یقینی ہے لیکن بدیہی نہیں ہے بلکہ نظری ہے‘ یعنی نظر کے ذریعے‘ غور وفکر کے ذریعے‘ انسان اس معرفت تک پہنچے گا۔ اور امام بیہقی علیہ الرحمہ نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔ یعنی انہوں نے کہا کہ نظر ضروری ہے اور قرآن مجید میں غور وفکر کی مستقل دعوت ہے‘ لہٰذا غور وفکر کے نتیجے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو پہچاننے کی دعوت بھی دے رہے ہیں اور اپنی توحید کی معرفت کی دعوت بھی دے رہے ہیں۔ تو امام بیہقی علیہ الرحمہ کا نکتہ نظر یہ ہے اور یہی اکثر علماء کا رہا ہے۔ باقی ہمارے علماء عقیدہ یہ نہیں کہتے کہ یہ معرفت بدیہی نہیں ہے‘ اس معنی میں کہ کسی کو بغیر دلیل کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ معنی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کو اور فلاں کو یہ معرفت واقعی بغیر دلیل کے حاصل ہو جائے‘ اللہ کی طرف سے وہبی طور پر‘ لیکن چونکہ یہ ایک عام قاعدہ نہیں ہے لہٰذا اس پر معرفت کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی کہ آپ سب کو یہ کہیں کہ اگر تم اللہ کو پہچاننا چاہتے ہو تو بس یہ بدیہی ہے‘ کسی دلیل کی حاجت نہیں ہے‘ بلکہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ سے بھی دلیل طلب کی کہ ﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (البقرۃ) اور خود غور وفکر کی دعوت دی ہے اور اس کے نتیجے میں کچھ نتائج بیان بھی کیے ہیں۔

بہرحال یہ بات ہمارے سامنے آئی تھی کہ غور وفکر ضروری ہے۔ لیکن یہاں ایک اور بات بہت اہم ہے جو امام غزالی

علیہ الرحمہ نے بیان کی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دلیل پر انحصار کر کے بیٹھیں گے۔ یعنی آپ کہیں گے کہ دلیل کے ذریعے میں نے اللہ کو پہچان لیا تو بس اب یقینی علم مجھے حاصل ہو گیا۔ نہیں! اگر آپ نے اللہ کو جاننے کے بعد اپنے عمل کے ذریعے اپنے اس یقین کی سیرابی نہیں کی تو یہ یقین رخصت بھی ہو سکتا ہے' یہ یقین جا بھی سکتا ہے۔ یعنی اگر انسان اپنی شہوات کے پیچھے لگ جائے اور دنیا پرستی اور دنیا کی محبت اس کے دل پر غالب آ جائے تو ہو سکتا ہے یہ یقینی معرفت رخصت ہو جائے۔ لہٰذا یہ نہیں ہے کہ دلیل کے ذریعے پہچان لیا اور اس پر فخر کیا کہ دلیل مجھے حاصل ہو گئی لہٰذا اللہ کے بارے میں قطعی علم ہے۔ نہیں! اس کے بعد نیک لوگوں کی صحبت میں بیٹھو' قرآن مجید کی تلاوت کرو' تذکر کے ساتھ' تدبر کے ساتھ' تم گناہوں سے دور رہو تا کہ جو معرفت کا چراغ تمہارے سینے میں روشن ہوا ہے کہیں یہ بجھ نہ جائے۔ تو یہ سارا کچھ انسان نے اختیار کرنا ہے۔ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے کے نتیجے میں علم بڑھتا چلا جائے گا' جیسے سورۃ البقرۃ کی آیت (۲۸۲) ہے جس سے صوفیاء استدلال کرتے ہیں: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ﴾ ''اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' اللہ تمہیں تعلیم دے گا''۔ تو کہتے ہیں کہ ایک تعلیم وہ ہے جو آپ نے اختیار کی' آپ نے حاصل کی اور تقویٰ اختیار کر لیا۔ اب تقویٰ اختیار کرنے کے بعد جو آپ پر علوم کے دروازے کھلیں گے یقیناً وہ ان علوم سے زیادہ بڑے ہیں' یا زیادہ قوی ہیں' یا ان کی شدت اور حدت زیادہ ہے جو آپ نے اس تقویٰ اختیار کرنے سے پہلے حاصل کیے تھے۔ یقیناً انسان دلیل کے پیچھے بھی جائے' غور وفکر سے کام بھی لے' لیکن اپنی ذہانت پر اسے کوئی ناز نہ ہو' بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی سے توفیق مستقل مانگتا رہے اور اس راستے پر چل پڑے تو یقیناً کچھ عرصے بعد اس کی یہ کیفیت ہو جائے گی' جیسا کہ امام غزالی فرماتے ہیں کہ وہ جو دلائل اس نے اللہ کے وجود پر قائم کیے تھے اب وہ اس کے لیے بے معنیٰ ہوں گے۔ کیونکہ وہ دلائل اس نے قائم کیے تھے غیب کی حالت میں رہتے ہوئے' وہ اللہ کو دیکھتا نہیں تھا' جانتا نہیں تھا' پہچانتا نہیں تھا۔ اب دلائل حاصل کرنے کے بعد جب وہ اس راستے پر چل پڑا اور اس نے اللہ کا تقویٰ اختیار کیا اور گناہوں سے دور ہو گیا تو اب یہ سارے حقائق اس کے لیے گویا عیاں ہو گئے۔ اگرچہ غیب ہی میں رہیں گے' لیکن وہ ایسے ہو جائیں گے جیسا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔

سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک روایت نقل کی جاتی ہے' ایک اور صحابی کے بارے میں بھی کہ انہوں نے کہا کہ لو رُفع الحجاب ما ازددتُ یقینًا اگر حجاب اٹھا بھی دیا جائے تو میرے یقین میں اضافہ نہ ہو۔ یعنی کہنا کیا چاہ رہے ہیں کہ مجھے اپنی آنکھوں پر اتنا یقین نہیں ہے' یا آنکھوں سے دیکھی ہوئی شے پر جتنا مجھے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پر ہے۔ اگر میں اللہ کو دیکھ بھی لوں گا تو اللہ کو دیکھنے سے پہلے بھی مجھے اپنی دیکھی ہوئی شے سے زیادہ اللہ پر یقین حاصل تھا۔ لہٰذا میرے یقین میں اضافہ نہیں ہو گا۔ اور وہ حدیث بھی آپ نے سنی ہو گی کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب پوچھتے تھے فجر کے بعد صحابہ سے: ((كَيْفَ اَصْبَحْتُمْ؟)) تو ایک صحابی نے فرمایا: اَصْبَحْتُ مُؤْمِنًا حَقًّا۔ مَیں نے تو ایک حقیقی مؤمن کی حالت میں صبح کی ہے۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر شے کی کوئی دلیل ہوتی ہے تم جو کہہ رہے ہو اس کی دلیل کیا ہے؟ تو ان صحابی نے فرمایا: گویا کہ میں اہلِ جنّت کو جنّت میں نعمتیں پاتا ہوا اور اہلِ دوزخ کو دوزخ میں عذاب کا شکار دیکھ رہا ہوں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صَدَقْتَ..... تم نے بات ٹھیک کی ہے' بس اس کو پکڑ لو۔ یعنی اب اس کیفیت پر جم جاؤ۔ تو گویا اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمیں یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تک پہنچنے کی جو راہیں ہیں وہ چند دلائل کے اندر منحصر ہیں' جس نے ان دلائل کو اختیار نہیں کیا گویا وہ اللہ تک نہیں پہنچا' نہیں! بلکہ جیسا کہ ہمارے صوفیاء کے ہاں یہ قول مشہور ہے: طرق اللہ بعدد الانفاس۔ اللہ کے رستے سانسوں کی مقدار جتنے ہیں۔ یعنی اللہ تک پہنچنے کے بہت سے رستے ہیں۔ اور یہ بہت سے رستوں

سے مراد نعوذ باللہ یہ نہیں ہے کہ دین اسلام بھی اور غیر دین بھی‘ مراد یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ دین میں داخل ہو گئے اور آپ نے عقائد حقہ اختیار کر لیے اور آپ دین پر چل پڑے تو اس کے بعد ایک ہی رستے کی بہت سی لینز ہیں‘ دائیں‘ بائیں آگے پیچھے جا سکتے ہیں‘ سب وہیں پہنچ رہے ہیں۔ تو دین حق کے اندر اللہ تک پہنچنے کی راہیں بہت سی ہیں اور ساتھ یہ بھی فرمایا بزرگوں نے کہ کئی دفعہ یہ ہو جاتا ہے کہ ایک رستے پر چلنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جو میرے رستے پر نہیں ہے وہ شاید ٹھیک نہیں ہے‘ لہٰذا وہ دوسرے کو دعوت دیتا ہے کہ میرے پاس آ جاؤ اور میری راہ اختیار کرو‘ جس رستے سے میں اللہ تک پہنچا ہوں وہی رستہ تم بھی اختیار کرو۔ وہ کہتے ہیں کہ کئی دفعہ غلطی لگ جاتی ہے‘ تو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر ہو سکتا ہے کہ آپ فرائض اختیار کر چکے ہیں تو ایک شخص ذکر اللہ کے رستے سے اللہ کے قرب تک پہنچ گیا‘ ایک صدقہ و خیرات کے ذریعے پہنچ گیا‘ ایک جہاد فی سبیل اللہ‘ قتال فی سبیل اللہ کے ذریعے پہنچ گیا‘ کسی کو قرآن سے کوئی خاص شغف حاصل ہوا تو اسے قراءتِ قرآن اور تلاوت نے ہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے قریب کر دیا۔ تو بہت سے رستے ہیں۔ یہ نہیں کہنا چاہیے اور یہ ہم سے غلطی بھی ہوتی ہے کہ ہم کوئی خاص رستہ اختیار کرتے ہیں‘ چاہے وہ انفرادی سطح پر یا اجتماعی سطح پر‘ پھر ہم سب کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ ہمارے طریقے پر آ جاؤ۔ جو ہمارے طریقے پر چل رہا ہے‘ وہی دین کے رستے پر ہے اور جو ہمارے طریقے پر نہیں ہے وہ دین کے رستے پر نہیں ہے۔

اس میں ایک اور مسئلہ بھی ہے کہ کئی دفعہ تزکیہ‘ تصوف اور سلوک کی راہ میں بھی ایسا ہوتا ہے‘ جو بزرگوں نے کہا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندوں کا تزکیہ بہت سے ذرائع سے فرماتا ہے: ﴿بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (النساء:۴۹) جس کا اللہ تزکیہ فرمانا چاہتا ہے وہ فرما دیتا ہے۔ تو کئی دفعہ تصوف کے حلقوں کے لوگوں میں یہ غلط فہمی بھی ہو جاتی ہے کہ جو شخص اگر کسی سلسلے میں نہیں ہے تو شاید مزکی نہیں ہوگا۔ اور کئی دفعہ وہ سلسلوں سے باہر لوگوں کو اس نگاہ سے دیکھ لیتے ہیں کہ شاید یہ حضرات مزکی نہیں ہو سکتے‘ کیونکہ انہوں نے یہ سلوک کی راہیں طے نہیں کیں۔ تو یہ نگاہ بھی خود تزکیہ کے منافی ہے۔ یعنی یہ نگاہ کہ کسی کو اس نگاہ سے دیکھا جائے کہ یہ شخص غیر مزکی ہے‘ اس کا تزکیہ نہیں ہوا تو ایسی نگاہ رکھنے والا شخص مزکی نہیں ہے‘ کیونکہ جو مزکی شخص ہوگا‘ جس کا تزکیہ ہو چکا ہوگا‘ وہ دوسروں کو ایسے ہی دیکھے گا کہ یہ مزکی ہے جب تک واقعی اور صریح اور قطعی دلیل مل نہ جائے کہ یہ شخص مزکی نہیں ہے۔ بہر حال یہاں ہمیں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ نظر اور غور و فکر ضرور اختیار کیجیے‘ لیکن محض یہ ذہنی ایکسرسائز نہیں ہے‘ بلکہ اس کے ساتھ پورے وجود کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے جھکا دیا جائے تو دلیل قطعی حاصل ہو جائے گی۔ وگرنہ صرف عقل کی بنیاد پر بیٹھے رہیں گے تو شبہات وارد ہوتے رہیں گے‘ شبہات آتے چلے جائیں گے۔ تو ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾﴾ (النساء) یہاں وَجْهٌ (چہرے) سے کل ذات مراد لی گئی۔ یعنی جس نے اپنی کُل ذات کو اللہ کے سامنے جھکا دیا اس حال میں کہ وہ احسان کرنے والا تھا۔ یعنی اس حال میں کہ وہ محسن تھا‘ اور اس نے ملت ابراہیمی کی پیروی کی جو یکسو تھے‘ اور اللہ نے تو ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا۔ تو یہ بات ہم نے جان لی کہ نظر ضروری ہے‘ لیکن نظر ہی سب کچھ نہیں ہے۔ نظر سے مراد غور و فکر ہے۔

کیا نظر (غور و فکر) موجب تکلیف ہے

اگلی بات ہم نے یہ دیکھی تھی کہ نظر کے نتیجے میں جو بات حاصل ہوگی وہ ہم پر واجب بھی ہوگی کہ نہیں؟ تو یہاں ہمارے سامنے تین موقف آئے تھے: اشاعرہ‘ ماتریدیہ اور معتزلہ کا۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ غور و فکر آپ نے کرنا ہے لیکن جب تک رسول نہیں آتا اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال رحمت یہ رکھی ہے کہ وہ حجت تمام نہیں کرتا۔ چاہو تو غور و فکر کرتے رہو‘ رسول کی دعوت پہنچے گی تو حجت تمام ہو جائے گی۔ اور احناف (ماتریدیہ) کا خیال یہ ہے کہ توحید کے بارے میں اللہ کی حجت رسول کے بغیر بھی تمام ہو جاتی

ہے اور قیامت کے دن اس کی پکڑ ہو سکتی ہے۔ معتزلہ نظر کو عقل کو بالذات موجب کہتے ہیں' اس لیے اہلِ سُنّت سے خارج ہیں۔

تیسری بات ہم نے یہ دیکھی تھی کہ غور وفکر اور نظر کا موضوع کیا ہے؟ اس کا موضوع اللہ تعالیٰ کی ذات مبارکہ نہیں ہے' کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذاتِ مبارکہ اِدراک سے ماوراء ہے' اس تک نہیں پہنچا جا سکتا' اس کی کنہ تک' اس کی حقیقت تک' اس کی ماہیت تک رسائی ممکن نہیں۔ ہم نے کہاں غور کرنا ہے' وہ حدیث میں آ گیا کہ ((تَفَکَّرُوْا فِی آلاء اللّٰہِ وَلَا تَتَفَکَّرُوْا فِی اللّٰہِ)) (سلسلة الاحادیث الصحیحة للالبانی ۱۷۸۸/۴) اللہ کی ذات میں تفکر نہیں ہوگا بلکہ اللہ کی ذات میں تفکر شرک تک پہنچا سکتا ہے۔ والعجز عن درک الادراک ادراک (دیوان علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ) اللہ کی ذات کی معرفت سے اپنے آپ کو عاجز شمار کر لینا ہی کمال معرفت ہے' معرفت کا منتہا ہے۔

مقصد غور وفکر

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں غور وفکر کی دعوت دی ہے۔ اس میں تو کسی کو شک نہیں ہوگا' یہ بات ہم دیکھ چکے ہیں۔ لیکن غور وفکر کی دعوت دی ہے تو غور وفکر کی کوئی جہت بھی معین کی ہے۔ غور وفکر تو بہت سے مقاصد کو پیش نظر رکھ کے ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کائنات میں غور وفکر کرتے ہیں اس نیت کے ساتھ کہ کائنات پر قبضہ کیسے کیا جائے اور اس سے فوائد کیسے اٹھائے جائیں؟ یہ بھی غور وفکر ہے۔ اور اگر اس غرض اور اس نیت کے ساتھ غور وفکر کیا جائے گا تو کچھ مختلف نتائج پیدا ہوں گے۔ اسی طرح آپ انسانی جسم پر غور وفکر اس اعتبار سے بھی کر سکتے ہیں کہ کیا شے اس کی صحت کا باعث ہے اور کیا شے اس کی صحت کا باعث نہیں ہے؟ یہ بھی غور وفکر کا ایک زاویہ ہے اور اس کے بھی کچھ نتائج پیدا ہوں گے۔ قرآن مجید میں غور وفکر کی تو دعوت دی گئی ہے' لیکن محض یہ کہنا کہ بس غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے' یہ درست نہیں ہے۔ بلکہ غور وفکر کی دعوت دے کر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس غور وفکر سے نتائج کیا حاصل کرنے ہیں اور کون سا غور وفکر ہے جو یہ نتائج پیدا کرے گا۔ اور اگر اللہ کے بتائے ہوئے نتائج پیدا نہیں ہو رہے تو غور وفکر اس نہج پر نہیں ہو رہا جس نہج پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دعوت دی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کی آیت لیتے ہیں۔ سورۂ آل عمران میں فرمایا: ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾﴾ ''زمین وآسمان کی تخلیق میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں ہوشمندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں''۔ ہوشمندوں کی کیا تعریف بتائی۔ فرمایا:

﴿الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾﴾

''جو اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں' کھڑے بھی' بیٹھے بھی اور اپنے پہلوؤں پر بھی' اور مزید غور وفکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں۔ اے ہمارے ربّ! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد تو پیدا نہیں کیا ہے۔ تو پاک ہے (اس سے کہ کوئی عبث کام کرے)' پس تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے!''

اور یہاں بھی بہت اہم بات ہے کہ ذکر فکر سے پہلے ہے یعنی محض فکر نہ ہو' اللہ کے قریب ہونے کے لیے غور وفکر ہو۔ غور وفکر کیوں ہوتا ہے کہ اللہ کی معرفت مزید بڑھے' میں اللہ کے مزید قریب ہو جاؤں۔ وہ غور وفکر ذکر کے دائرے کے اندر ہو' ذکر سے ماوراء اور مجرد غور وفکر نہ ہو۔ اچھا غور وفکر کرتے ہیں تو کس نتیجے پر پہنچتے ہیں؟ کیا غور وفکر کر کے نتیجتاً کائنات کو مسخر کر کے اس کو اپنے قبضہ قدرت میں لا کے اپنی شہوات کی تسکین کرتے ہیں؟ نہیں یہ نہیں کہا' بلکہ نتیجہ بتایا:

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾﴾

''اے ہمارے رب! تُو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے۔ تُو پاک ہے (اس سے کہ کوئی عبث کام کرے)' پس تُو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے!''

آپ دیکھیں ہوشمند اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ بے مقصد نہیں ہے' بے مقصد نہیں ہے تو قیامت برحق ہے' لہٰذا ہمیں آگ سے بچا لے۔ یعنی ایک نتیجہ بھی بیان کیا کہ غور وفکر کا نتیجہ کیا نکلا ہے۔ اسی طریقے پر آگے یہ آیات پڑھتے چلے جائیں' معلوم ہو جائے گا کہ ہوشمندوں کی اصل ٹینشن کیا ہوتی ہے۔ آگے فرمایا:

﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝۱۹۲ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۣ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝۱۹۳﴾

''اے ہمارے ربّ! جس کو تو نے داخل کر دیا آگ میں بے شک اس کو تو نے رسوا کر دیا۔ اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوں گے۔ اے ہمارے ربّ! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا' جو ایمان کی ندا دے رہا تھا کہ ایمان لاؤ اپنے ربّ پر' تو ہم ایمان لے آئے۔ اے ہمارے ربّ' ہمارے گناہ بخش دے! اور ہماری برائیاں ہم سے دور کر دے! اور ہمیں وفات دیجیو اپنے نیکوکار (اور وفادار) بندوں کے ساتھ۔''

اسی طریقے پر دیکھیں کہ سورۃ الرعد شروع ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے بہت سی نشانیوں کا ذکر کیا۔ یہ نشانیاں کیوں ہیں؟ یعنی اس سے نتیجہ کیا نکلنا چاہیے؟ غور وفکر سے کیا نتیجہ حاصل ہوگا؟ دوسری آیت میں بہت سی نشانیوں کے ذکر کے بعد فرمایا: ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝۲﴾ یعنی اس غور وفکر کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ تمہیں اپنے ربّ کی ملاقات پر مزید یقین حاصل ہوتا چلا جائے۔ تو محض غور وفکر کی دعوت نہیں ہے' بلکہ وہ غور وفکر کہ جس کے نتیجے میں انسان اللہ کے قریب ہو۔ اور اگر غور وفکر یہ نتیجہ پیدا نہیں کر رہا تو جان لینا چاہیے کہ یہ قرآنی غور وفکر نہیں ہے۔ پھر امام بیہقی علیہ الرحمہ نے ''آیت الآیات'' نقل کی ہے۔ مشہور آیت ہے:

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ مِنْ مَّاۗءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَاۗبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۱۶۴﴾ (البقرۃ)

''یقیناً آسمان اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں' اور اُن کشتیوں (اور جہازوں) میں جو سمندر میں (یا دریاؤں میں) لوگوں کے لیے نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور اُس پانی میں کہ جو اللہ نے آسمان سے اتارا ہے پھر اس سے زندگی بخشی زمین کو اس کے مُردہ ہو جانے کے بعد' اور ہر قسم کے حیوانات (اور چرند پرند) اس کے اندر پھیلا دیے' اور ہواؤں کی گردش میں (ہواؤں کی گردش کے مختلف انداز اور مختلف پہلو ہیں' کبھی شمالاً جنوباً چل رہی ہے' کبھی مشرق سے آ رہی ہے' کبھی مغرب سے آ رہی ہے' اس گردش میں بڑی حکمتیں کارفرما ہیں) اور ان بادلوں میں جو معلّق کر دیے گئے ہیں آسمان اور زمین کے درمیان یقیناً نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔''

اور پھر دیکھیے نتیجہ:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ

الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ (البقرۃ)

''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر کچھ اور چیزوں کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بنا دیتے ہیں' وہ ان سے ایسی محبت کرنے لگتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے' اور جو لوگ واقعتاً صاحبِ ایمان ہوتے ہیں ان کی شدید ترین محبت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور اگر یہ ظالم لوگ اُس وقت کو دیکھ لیں جب یہ دیکھیں گے عذاب کو' تو (ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ) قوت تو ساری کی ساری اللہ کے پاس ہے' اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

یعنی اس تمام غور و فکر کے نتیجے میں اہل ایمان اللہ کی محبت میں شدید تر ہو جاتے ہیں۔ تو مجرد غور و فکر نہیں ہے بلکہ غور و فکر ایک نتیجے کے ساتھ ہے۔ قرآن مجید نے ہمیں کہا ہے کہ غور و فکر کرو' لیکن یہ ہمیں بالکل واضح رہنا چاہیے کہ قرآن نے دعوت دینے کے بعد بتایا ہے کہ صحیح غور و فکر کہاں پہنچاتا ہے۔

آیت کائنات

اللہ تعالیٰ نے اس پوری کائنات کو'' آیت'' کہا ہے۔ یعنی اس کے لیے جو لفظ اختیار کیا وہ نشانی کا ہے۔ اور ہمارے علماء نے کہا کہ آیت (نشانی) فی نفسہٖ حقیقت نہیں رکھتی جب تک اس کو اس سے جوڑ کر نہ دیکھا جائے جس کی طرف وہ اشارہ کرنے والی ہے' جس کی طرف وہ نشاندہی کر رہی ہے۔ یعنی جیسے ایک سائن بورڈ ہوتا ہے۔ سیّد نقیب العطاس صاحب (ملائشیا) نے مثال بھی دی کہ کوئی شخص اگر چلتا ہوا جا رہا ہے موٹروے پر یا کسی راستے میں اور اس نے اپنی منزل تک پہنچنا ہے' تو بہت سے سائن بورڈز آتے رہتے ہیں' اِدھر چلے جاؤ' یہاں یوں مڑ جاؤ۔ تو اگر کوئی سائن بورڈ آ جائے جو اپنی ذات میں بڑا خوبصورت ہو اور سونے اور جواہرات سے مزین ہو' تو یہ صاحب جو اپنی منزل پر رہے تھے لیکن وہ اب گاڑی سے اتر گئے اور اس سائن بورڈ کے اوپر غور و فکر شروع کر دیا کہ یہ کس کس شے سے بنا اور کیا ہی خوبصورت ہے اور اسی غور و فکر میں یہ بھول گئے کہ اس کی اصل حقیقت تو سائن بورڈ کی تھی۔ یعنی یہ فی نفسہ پھر بھی حقیقت نہیں ہے۔ یہ اشارہ کسی اور ذات کی طرف کر رہا ہے۔ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس پوری حقیقت کو نشانی (آیت) کہا ہے۔

فرمایا: ﴿قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ (یونس) ''ان سے کہیے کہ دیکھو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ لیکن یہ نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کے کچھ کام نہیں آتے جو ایمان نہیں لانا چاہتے''۔ تو گویا اللہ تعالیٰ بتا رہے ہیں کہ اگر تم نے اس کائنات کو مجھ سے کاٹ کر دیکھنے کی کوشش کی تو تم اس کی حقیقت تک کبھی بھی نہیں پہنچ سکو گے۔ یعنی یہ کائنات اپنی حقیقت پاتی ہے اس وقت جب یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے جڑی ہو اور اللہ سے جوڑ کے اسے دیکھا جائے۔ تو یہ ہے غور و فکر جس کی طرف قرآن داعی ہے اور مستقل کہہ رہا ہے کہ غور و فکر کرو۔ اور اگر تم اس نہج پر غور و فکر کرو گے تو اس سے منع بھی نہیں کیا کہ تم اس سے فائدے نہ اٹھاؤ۔ لیکن تمہارا اصل مقصد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے قریب ہونا ہوگا۔ اصل مقصد خدا کا تقرب ہوگا۔ اور یہ بات ہر طالب علم کو' مجھے بھی اور آپ کو' مستحضر رکھنی چاہیے کہ ہماری کل علمی حرکت کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کا تقرب ہے۔ اور یہ بات بیچ میں سے کسی وقت بھی غائب ہو جائے تو پھر یہ سب کچھ ایک مشغلہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ پڑھنا' پڑھانا یہ ایک لذّت ہے' اس میں مزہ بھی آتا ہے۔ کچھ لوگوں کو فلمیں دیکھنے میں مزہ آتا ہوگا تو کچھ لوگوں کو کتاب پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔ تو پھر مزے سب ہی حاصل کر رہے ہیں۔ تو صرف مزہ نہیں حاصل کرنا' بلکہ ہر سرگرمی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے قریب ہونا ہے' چاہے آپ غور و فکر کر رہے ہیں' چاہے آپ پڑھ رہے ہیں' چاہے آپ کچھ اور کر رہے ہیں۔ کیونکہ انسان کا وجود صرف اللہ کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریٰت)

''اور میں نے نہیں پیدا کیا جنّوں اور انسانوں کو مگر صرف اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

گویا انسان کی ہر حرکت اور ہر سکنت کا واحد مقصود اور غایت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا اور اس کا قرب ہونا چاہیے: ﴿وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾﴾ (النجم) اور اس لحاظ سے یہاں علماء نے کہا کہ چونکہ اصل مقصود اللہ کی معرفت ہے' ایسی معرفت جو اللہ کے قریب کرے اور عبادت پر آمادہ کرے تو دنیا انہی لمحاتِ فرصت کا نام ہے کہ آپ یہ معرفت اور قرب حاصل کرلیں۔ اس لحاظ سے جس وقت ہم جی رہے ہیں اور ابھی تک حیات ہیں یہی موقع ہے جس میں آپ نے اللہ کے قریب ہونا ہے' تاکہ قیامت میں جب آپ جنّت میں چلے گئے تو آپ اللہ کے مزید قریب ہوتے چلے جائیں گے۔ لیکن امام غزالی فرماتے ہیں کہ اس درجے سے قریب ہوں گے جس درجے کی معرفت آپ نے یہاں دنیا میں حاصل کی ہے۔ مثال کے طور پر سیّدنا صدّیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی جنّت میں اللہ کی معرفت کے درجات میں لامتناہی بڑھتے چلے جائیں گے اور ایک عام درجے کا جنتی بھی لامتناہی بڑھتا چلا جائے گا۔ لیکن دونوں برابر نہیں ہیں' کیونکہ جس نسبت سے وہ بڑھ رہے ہیں وہ نسبت ہے معرفت کی جو وہ دنیا سے لے کر گئے ہیں اور یہاں جو ایک عام آدمی دنیا سے معرفت لے کر گیا وہ اسی نسبت سے چل رہا ہے۔ یعنی دونوں گاڑیاں چل رہی ہیں' لیکن ایک ہزار کی رفتار پر ہے اور ایک دس کی رفتار پر ہے۔ دونوں ہمیشہ چلتی رہیں گی لیکن دونوں کبھی مل نہیں سکتیں' دونوں میں مستقل فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ تو جو جنّت میں درجات میں اضافہ ہے کہ صاحب قرآن سے کہا جائے گا: اِقْرَأْ وَارْقَ ''پڑھو اور چڑھتے چلے جاؤ!'' تو اس کا سارا دارومدار اس وقت کی معرفت پر ہے۔ یعنی اس وقت اللہ کو کتنا پہچانا' اس کی صفات کی معرفت' اس کی سنن کی معرفت' اور اس کا قرب' اس کی محبّت . . . . تو اہم بات یہ ہے۔

معرفت اجمالی و تفصیلی

اگلی بات انہوں نے کی کہ اللہ کی معرفت آپ ان آیات سے حاصل کریں گے۔ یہ جو مختلف آیات قرآن مجید میں آرہی ہیں' اس کے ذریعے اللہ کے قریب ہوں گے' کائنات میں غور وفکر کریں گے اور کہا کہ معرفت کی بھی دو اقسام ہیں۔ جیسے ہم نے کہا تھا کہ ایک دلیل اجمالی ہوتی ہے' ایک دلیل تفصیلی ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک اللہ کی معرفت اجمالی ہے اور ایک اللہ کی معرفت تفصیلی ہے اور شاید معرفتوں کے اسی فرق کے ساتھ کہ ایک شخص عام مسلمان ہوتا ہے' ایک شخص اللہ کا ولی ہوتا ہے۔ یعنی اللہ کو پہچانتے تو دونوں ہیں' لیکن کیا فرق ہے؟ بہت خوبصورت طریقے سے سمجھایا' شاید مَیں اس طرح نہ سمجھا سکوں۔ دیکھیں! آپ جانتے ہیں کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ ﴿وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا﴾ قرآن مجید میں اللہ کی صفات کے ساتھ ''کُلّ'' آتا ہے۔ ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا﴾ ﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ﴾ اب آپ نے جب یہ معرفت حاصل کرلی کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے' ہر شے کا جاننے والا ہے' ہر شے کا نگران ہے' حفیظ ہے' کارساز ہے تو آپ کو ایک اجمالی معرفت حاصل ہوگئی۔ آپ جان رہے ہیں کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ اجمالی معرفت مسلمان بنانے کے لیے بالکل کافی ہے اور ان شاء اللہ جنّت میں بھی پہنچا سکتی ہے۔ لیکن جو ایمانی احوال پیدا ہونے ہوتے ہیں وہ صرف اجمالی معرفت سے پیدا نہیں ہوتے۔ یعنی آپ نے جان لیا اللہ ہر چیز کا کارساز ہے۔ اللہ کے اذن کے بغیر کسی شے میں حرکت بھی نہیں ہوسکتی۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں' میں بھی جانتا ہوں' لیکن ہر وقت میرا دل اسباب کی وجہ سے گھبراتا رہتا ہے۔ یہ اجمالی معرفت تو مجھے حاصل ہے کہ ہر شے کا نگران اللہ ہے' ہر شے اللہ دیکھ رہا ہے' ہر شے اللہ کے اذن اور مشیت کے تابع ہے۔ سب جانتے ہیں۔ لیکن یہ تفصیلی معرفت ایسے بنتی ہے کہ آپ اس اجمالی معرفت کا مشاہدہ روزمرہ کرنا شروع کردیں۔ اس کے نتیجے

میں آپ کے ایمانی احوال پیدا ہونا شروع ہو جائیں۔ کوئی آپ کو خطرہ ہے لیکن آپ وہاں اس خطرہ کو دیکھتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ اللہ کے اذن کے بغیر کچھ نہیں ہو گا' لہٰذا آپ امن اور اطمینان کی کیفیت میں چلے جاتے ہیں تو یہ اس اجمالی معرفت کا تفصیلی بن جانا ہے۔ یعنی آپ صرف اجمالی طور پر یہ نہیں جانتے کہ ﴿اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ﴾ بلکہ آپ کہہ رہے ہیں کہ کُلِّ شَیۡءٍ میں زید بھی ہے' بکر بھی ہے یہ بھی ہے' فلاں بھی ہے۔ ہر شے پر اللہ کی قدرت کا مشاہدہ کر رہے ہیں تو معرفت اجمالی یہاں معرفت تفصیلی بن رہی ہے۔ تو معرفت اجمالی یقیناً بہت بڑی شے ہے۔ لیکن جیسے ابھی جس طرح کے حالات ہیں' آج کل ہر شخص وبا کی وجہ سے ایک خوف کی حالت میں ہے اور اضطراب (anxiety) کی کیفیت میں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اللہ کے اذن کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔ بات تو ٹھیک ہے' مانتے ہیں' لیکن اس پر اطمینان نہیں ہو رہا۔ یعنی اس کی وجہ سے جو اطمینان پیدا ہونا چاہیے وہ انہیں حاصل ہو رہا کہ

﴿قُلۡ لَّنۡ یُّصِیۡبَنَاۤ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا ۚ ہُوَ مَوۡلٰىنَا ۚ وَعَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۱﴾﴾

(التوبۃ)

''آپ کہہ دیجیے کہ ہم پر کوئی مصیبت نہیں آ سکتی سوائے اُس کے جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہو' وہی ہمارا مولا ہے' اور اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے اہلِ ایمان کو۔''

ہمیں تو پہنچے گا بھی وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے۔ اور لکھ دیا ہے تو' نعوذ باللہ' وہ کوئی ہمارا دشمن نہیں ہے' بلکہ ھو مولنا وہ ہمارا مولیٰ بھی ہے۔ اور اللہ ہی پر توکل کرنا ہے۔ تو یہ اجمالی معرفت تو مجھے بھی حاصل ہے لیکن میرے اندر وہ کیفیات پیدا نہیں ہو رہیں' بلکہ مجھے خوف ہے' ڈر ہے اور میرے اوپر anxiety کی کیفیت طاری ہے۔ تو یہ کیا ہے؟ یعنی اگر وہ معرفت تفصیلی ہو چکی ہوتی تو یہ نہ ہوتا۔ سچی بات ہے۔ جو کہا گیا کہ ﴿اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿ۚۖ۶۲﴾﴾ (یونس) اس سے مراد آخرت کی کیفیت ہے' لیکن دنیا میں بھی اس کا پرتو تو ہوتا ہے۔ ان کے خوف کی نوعیت اور ہوتی ہے' ان کا خوف کچھ اور ہوتا ہے۔ ایک شخص کو اگر اپنی موت سے زیادہ اس بات کا اندیشہ ہو کہ اس کا حسن خاتمہ ہے یا کہ نہیں؟ تو یہ اللہ کے ولی کی ایک نشانی ہے۔ پچھلے دنوں ایک صاحب بتا رہے تھے کہ آج کل ہم میں قوت مدافعت جو بہت کمزور ہو گئی ہے' تو اللہ کے نبی ﷺ نے بتایا کہ کمزوری ''وہن'' ہے۔ یعنی ''وہن'' کا ترجمہ لغت کے اعتبار سے آپ قوت مدافعت کی کمزوری بھی کر سکتے ہیں۔

سنن ابی داوٗد کی روایت کے مطابق حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قریب ہے کہ اقوامِ عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی دعوت دیں گی جیسا کہ کھانا کھانے والے ایک دوسرے کو اپنے دستر خوان کی طرف بلاتے ہیں''۔ اس پر کسی نے عرض کیا: ''کیا اُس روز ہم تعداد میں کم ہوں گے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تعداد میں تو اُس روز تم بہت زیادہ ہو گے' لیکن تمہاری حیثیت جھاگ سے زیادہ نہ ہو گی' جیسا کہ سیلاب کا جھاگ ہوتا ہے' اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت نکال باہر کرے گا اور خود تمہارے دلوں میں وہن (کی بیماری) ڈال دے گا''۔ پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! وہن کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((حُبُّ الدُّنْیَا وَکَرَاھِیَۃُ الْمَوْتِ)) ''دنیا کی محبّت اور موت سے نفرت!''---- تو یہ قوتِ مدافعت کی کمزوری ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی معرفت اجمالی پر ہمیں قناعت کر کے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ اگر ہم اس پر قناعت کر کے بیٹھ گئے اور اس معرفت میں ہم نے مستقل اضافے کی کوشش نہ کی تو یقیناً یہ خسارے کی سی کیفیت ہے۔ کائنات پر غور و فکر کرنا ہے اس نیت سے کہ اللہ کے قریب

ہوں۔ ذکر پہلے ہے‘ فکر بعد میں ہے۔ اس کے بعد یہ ہے کہ اس غور وفکر کے نتیجے میں اللہ کی معرفت بڑھتی چلی جانی چاہیے۔ اور معرفت بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد اجمالی معرفت سب کو حاصل ہوگئی ہے تو اس میں تفصیلات پیدا ہوتی چلی جائیں اور یہ ایک لامنتہا دنیا ہے‘ اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اسی لیے آپ دیکھیں کہ جنّت میں بوریت نہیں ہے‘ اس لیے کہ وہاں اللہ کی ذات کی معرفت‘ قرب اور محبّت میں لامتناہی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

دلیلِ حدوث وعنایت

امام بیہقی علیہ الرحمہ نے بہت سی آیات نقل کی ہیں جس میں‘ میں نے آپ کو بتادیا ایک ’’آیت الآیات‘‘ ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

﴿قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ (یونس:۱۰۱)

’’ان سے کہیے کہ دیکھو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔‘‘

اس کو متکلمین کی اصطلاح میں کہتے ہیں دلیل عنایت۔ ایک تو دلیل حدوث ہے وہ بھی انہوں نے بیان کی کہ آپ کائنات کو جب دیکھیں گے تو آپ کو یہ معلوم ہوجائے گا کہ یہ کائنات اپنے بل بوتے پر نہیں کھڑی ہوئی‘ اور اس میں مستقل جو تغیّر ہے‘ ہر چیز بدل رہی ہے‘ تو یہ تغیّر اس کے حدوث یعنی اس کے عدم سے پیدا ہونے کی دلیل ہے۔ ہمارے متکلمین نے تفصیل سے یہ دلائل بیان کیے ہیں کہ کس طرح چیزوں کا تغیّر ان کے حدوث‘ ان کے عدم سے پیدا ہونے کی دلیل ہے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ ابراہیمی طریقہ ہے۔ ابراہیمی طریقہ اس کو اس لیے کہا کہ سورۃ الانعام میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دلیل آئی ہے‘ جب انہوں نے پہلے ستارے کو اور پھر چاند کو دیکھا:

﴿فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝۷۷﴾ (الانعام)

’’پھر جب انہوں نے دیکھا چاند چمکتا ہوا تو کہا یہ ہے میرا ربّ! پھر جب وہ بھی غائب ہوگیا تو انہوں نے کہا اگر میرے رب نے مجھے ہدایت نہ دی تو میں گمراہوں میں سے ہوجاؤں گا۔‘‘

متکلمین نے یہاں سے دلیل حدوث حاصل کی ہے۔ وہ دلیل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے کہا جو شے متغیّر ہے‘ جو مستقل اپنی حالت سے دوسری حالت میں بدل رہی ہے‘ وہ قدیم نہیں ہوسکتی‘ وہ خدا نہیں ہوسکتا‘ وہ حادث ہے۔ گویا کسی شے کے تغیر سے اس کے حدوث پر دلیل۔ پھر اسی طریقے پر انہوں نے مثال دی ہے‘ انسان اپنے بارے میں غور کرے تو وہ بھی ایک حال سے دوسرے حال میں ہے۔ یعنی

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ﴾ (الحج:۵)

’’اے لوگو! اگر تمہیں دوبارہ اٹھائے جانے کے بارے میں شک ہے تو (ذرا غور کرو کہ) ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے پھر علقہ سے پھر گوشت کے لوتھڑے سے‘ واضح شکل والا اور غیر واضح شکل والا تاکہ ہم کھول کھول کر بیان کردیں تمہارے لیے۔ اور ہم ٹھہرائے رکھتے ہیں رحموں کے اندر جو ہم چاہتے ہیں ایک وقت معیّن تک‘ پھر ہم نکالتے ہیں تمہیں ایک چھوٹے سے بچے کی صورت میں‘ پھر تم پہنچتے ہو اپنی جوانی کو۔‘‘

امام بیہقی کہتے ہیں کہ ہمارے علماء کلام نے اور دلائل تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔اس لیے کہ امام بیہقی خود ایک بہت بڑے متکلّم کے شاگرد تھے جو اشعری مکتب فکر کے تھے اور جن کا نام ابن فورک تھا۔اور ابن فورک ابوالحسن الباہلی کے شاگرد تھے اور ابوالحسن الباہلی ابوالحسن الاشعری کے بالواسطہ شاگرد تھے۔تو یہ بالکل اس سلسلے میں آتے ہیں۔تو وہ اس طرح کے مسائل میں کہہ دیتے ہیں کہ تفصیلی کتابیں جو ہمارے متکلمین نے اور علماء نے لکھ دی ہیں ان کو دیکھ لو۔لیکن اجمالاً بتا رہے ہیں کہ تغیر حدوث پر دلیل ہے۔میں بتا رہا تھا دلیل عنایت۔عنایت کا مطلب ہوتا ہے کسی کی دیکھ بھال کرنا۔وہ کہہ رہے ہیں کہ دلیل عنایت کا مطلب ہے کہ بندہ اگر دنیا میں اپنی حالت پر غور کرے گا تو ایسا لگے گا کہ اللہ نے ایک دسترخوان سجایا ہوا ہے۔پوری دنیا گویا اس طرح بنائی گئی ہے اور اس میں انسان کو مہمان کے طور پر بھیجا گیا ہے اور انسان کے لیے اشیاء کو مسخر کیا ہے' کھانے کے لیے زمین اس کو نکال کے دے رہی ہے۔سواری کرنے کے لیے چوپائے ہیں وغیرہ وغیرہ۔اسے محسوس یہ ہوتا ہے کہ کوئی اس کی مستقل دیکھ بھال کر رہا ہے۔یہ عنایت ہے۔اللہ کے وجود تک تو وہ پہلے پہنچ چکا ہے دلیل حدوث کے نتیجے میں۔دلیل عنایت سے اللہ کے لیے کمال درجے کے شکر و امتنان کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔یعنی صرف دلیل حدوث سے آپ یہ تو نہیں پہچانیں گے کہ اللہ سے مجھے محبّت بھی کرنی چاہیے۔ہوسکتا ہے آپ کہیں خواہ مخواہ مجھے پیدا کر دیا' ایسے ہی مصیبت میں ڈال دیا۔غصہ بھی پیدا ہوسکتا ہے۔کچھ لوگ اسی غصہ کی وجہ سے کہہ دیں کہ خدا ہی نہیں ہے۔تو کہتے ہیں کہ جب انسان اس طرح غور کرتا ہے کہ کائنات کس طرح اس کی خدمت میں لگائی گئی ہے اور واقعی اللہ نے ایک دسترخوان سجایا ہے تو پھر اللہ کے لیے شکر اور محبّت کے جذبات پیدا ہو جائیں گے' اور جب تک یہ پیدا نہیں ہوتے محض خدا کے وجود کی معرفت کافی نہیں' وہ وبالِ جان بھی ہوسکتی ہے' کیونکہ محبّت پیدا نہیں ہوئی۔اور یہ حکمت کی معراج ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾﴾ (لقمٰن)

''اور ہم نے لقمان کو دانائی عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر ادا کرو! اور جو کوئی بھی شکر کرتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے اپنے ہی بھلے کے لیے۔اور جو کوئی ناشکری کرتا ہے تو اللہ بے نیاز ہے اور وہ اپنی ذات میں خود محمود ہے۔''

صفاتِ عقلیہ

پھر کہتے ہیں کہ انسان جب غور کرتا ہے کائنات پر اور ان سارے مظاہر کا مشاہدہ کرتا ہے تو پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کچھ صفات کو بھی پہچانتا ہے جن کو اہلِ سُنّت صفاتِ عقلیہ کہتے ہیں۔صفاتِ عقلیہ کا مطلب ہے کہ رسول کی آمد سے پہلے انسان کائنات کو دیکھ کر غور و فکر کر کے اللہ کی کچھ صفات تک پہنچ جاتا ہے۔اگرچہ اس میں کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ عقل کے ذریعے نہیں پہنچا جاسکتا' لیکن متکلمین کا اس پر اتفاق ہے کہ عقل کے ذریعے ایسی صفات تک کہ جس پر نبی کی نبوت کی تصدیق کا دارومدار ہے' انسان پہنچ جاتا ہے۔جب وہ یہ کائنات دیکھ رہا ہے' دلیل عنایت بھی اُس نے دیکھی تو اُسے معلوم ہوگیا کہ اُس کا پیدا کرنے والا' نعوذ باللہ ''میّت'' نہیں ہوسکتا' وہ ''حیّ'' ہے۔وہ مدبر ہے۔پھر اسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ صاحب ارادہ ہے' اُس کا ارادہ کارفرما ہے' وہ صاحب علم ہے۔اُس کے سوا کوئی اور اس طرح کا نہیں ہوسکتا۔یہ وحدانیت ہے۔یہ توحید کی دلیل ہے۔

پھر فرماتے ہیں یہ بھی بہت اہم بات ہے کہ نتیجہ میں وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات میں کسی شے کی مانند بھی نہیں ہوسکتا۔یعنی اگر اللہ ان حادث اشیاء کے کسی بھی اعتبار سے مانند ہوتا تو حادث ہوتا' کیونکہ یہ حادث اشیاء جتنی بھی ہیں ان کے اوپر ہر وقت علاماتِ حدوث ہیں' ان کا جسم ہونا' ان کا محدود ہونا' ان کا تغیّر' ان کی حرکت' فلاں فلاں یہ سب تو ان کے

حدوث کی دلیل ہے‘ان کے عدم سے پیدا ہو جانے کی دلیل ہے۔اگر اللہ تعالیٰ ان صفات میں ان کی مانند ہوتا تو وہ بھی حادث ہوتا‘اُس کو کسی اور الہ کی ضرورت ہوتی اور کہیں نہ کہیں یہ سلسلہ پیچھے جا کے رکنا تھا۔تو جہاں بھی رکے گا‘جو بھی کائنات کا خالق و مالک ہوگا وہ مانندِ کائنات نہیں ہوگا۔ہم تفصیل سے بیس صفات کے بارے میں الگ الگ دیکھیں گے کہ جن کے بارے میں علماء کہتے ہیں کہ جاننا ضروری ہے۔بیس صفات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف بیس ہی ہیں‘لیکن بیس وہ ہیں جن کو جاننا ضروری ہے اور جن پر باقی صفات کا دارومدار ہے۔ان میں ایک بنیادی صفت ہے : مخالفة للحوادث (حوادث کی مخالفت)۔اللہ تعالیٰ کسی شے کے مانند نہیں ہے۔ اور قرآن سے اس کے دلائل کیا ہیں:﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ:۱۱) اور﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۝۴﴾ (الاخلاص) ﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا۝۶۵﴾ (مریم) ’’کیا تم اللہ کے ہم صفت کسی کو جانتے ہو؟‘‘

تو یہ قرآن مجید کی محکم آیات ہیں جن سے معلوم یہ ہوا کہ اللہ کے مانند کچھ بھی نہیں ہے۔تو اللہ تعالیٰ اس کائنات کے مانند نہیں ہیں۔مانند نہیں ہیں تو وہ جسمانیات سے‘زمان و مکان سے ہر شے سے ماوراء ہے۔نہ وہ زمان میں ہے‘نہ وہ وجود متزمن ہے نہ وجود متمکّن ہے۔متمکّن بمعنیٰ مکان میں۔اور متزمن بمعنیٰ زمان میں۔وہ time and space کی ہر شے سے ماوراء ہے۔بالکل لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ۔تو یہ بھی غور و فکر کر کے انسان پہنچ سکتا ہے۔کیسے پہنچا؟ کائنات کی چیزوں کو دیکھ کر جب جانا کہ یہ حادث ہیں ان ان صفات کی وجہ سے تو یہ صفات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات والا صفات میں نہیں ہوسکتیں۔تو فرماتے ہیں کہ یہ وہ طریقہ ہے کہ جس کو اختیار کر کے انسان اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت حاصل کرسکتا ہے۔

معرفت بذریعہ نبی

پھر اس کے بعد ایک اہم بات ہے کہ یہ جو عقلی دلائل کا ایک سفر ہوتا ہے تو یہ کئی دفعہ مشکل لگتا ہے اور مقدمات بڑے طویل ہو جاتے ہیں کہ اس کا نتیجہ یہ‘اس کا نتیجہ وہ وغیرہ۔کہتے ہیں کہ ایک آسان طریقہ ہے نبی کو جان لو سارے حقائق معلوم ہو جائیں گے۔ ہمارے اصحاب میں سے کچھ لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔اور امام ابوالحسن الاشعری علیہ الرحمہ نے اپنی کتابوں میں یہ دونوں طریقے بیان بھی کیے۔اور کہتے ہیں کہ ہم جیسے لوگوں کے لیے دوسرا طریقہ شاید مفید ہوتا ہے۔یعنی عقلی دلائل میں پڑ گئے اور سمجھ نہیں آ رہا اور بیچ میں شبہات وارد ہو گئے اور کس کے پاس جائیں اور کس کے پاس نہ جائیں۔اللہ کے نبی ﷺ کے زمانے میں کتنے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے آپ ﷺ کو دیکھا اور آپ ﷺ کو دیکھنے کے بعد جان لیا کہ آپ ﷺ سچے ہیں۔اور جب آپ ﷺ سچے ہیں تو آپ ﷺ کے بتائے ہوئے تمام حقائق‘حقائق ہیں۔یعنی آپ ﷺ نے بتایا کہ اللہ واحد ہے تو واحد ہے بس۔کیونکہ آپ ﷺ رسول ہیں اور رسول کی صداقت پر دلیل قائم ہو چکی ہے۔اور یہ معجزہ رکھتے ہیں۔تو فرماتے ہیں کہ ہمارے کچھ اصحاب نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی معرفت حاصل کرو‘ان کے معجزات کی معرفت حاصل کرو‘ان کی صفات کی معرفت حاصل کرو۔اور اس کے نتیجے میں تم رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو پہچان لو گے اور اس پہچان کے نتیجے میں وہ تمام حقائق جو تم نے عقلی سفر کے ذریعے طے کرنے تھے وہ یک مشت طے ہو جائے گا۔ایک ہی چھلانگ میں پہنچ جاؤ گے۔اور یہ خصوصیت صحابہ کی ہے۔یعنی آپ یہ نہ سمجھیں کہ صحابہ کو عقلی دلائل نہیں آتے۔یہ غلط بات ہے۔صحابہؓ کے اقوال سے ہم نے عقلی دلائل نکالے ہیں‘لیکن وہ ان عقلی دلائل سے پہلے رسول اللہ ﷺ کو دیکھ چکے تھے۔رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے جو انہیں ایمان حاصل ہوا وہ یقیناً ان عقلی دلائل سے حاصل نہیں ہوتا۔اسی لیے امام رازیؒ کی وفات کے وقت جب یہ ذکر آتا ہے کہ میں نیشاپور کی بوڑھی خواتین کے عقیدے پر

جان دیتا ہوں تو اس سے مراد یہ تھی کہ ان کے عقیدے میں جو قوت ہوتی ہے اور جو یقین کی کیفیت ہوتی ہے وہ کئی دفعہ ایک متکلم کو ضروری نہیں ہے کہ ہزار دلائل کے بعد بھی حاصل ہو جائے۔ تو وہ متکلم بھی کئی دفعہ تمنا یہ کر رہا ہوتا ہے کہ یہ بڑھیا جو کوئی دلیل نہیں جانتی لیکن ایسا قوی ایمان رکھتی ہے کاش یہ قوی ایمان ہمیں بھی حاصل ہو جائے۔

نبوت کے مقدمات کے ذریعے اور نبوت کی معرفت کے ذریعے اللہ سبحانہ وتعالیٰ تک پہنچنے کے پھر انہوں نے دلائل بھی دیے ہیں۔ اس میں سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی وہ تقریر بھی نقل کی جو انہوں نے نجاشی کے سامنے کی تھی۔ کہتے ہیں: کنا علی ديننا ''ہم اپنے دین پر تھے''۔ یعنی دین اهل مكة حتىٰ بعث الله عزوجل فينا رسولا ''یہاں تک کہ اللہ نے ہمارے درمیان ایک رسول بھیج دیا''۔ اب پہلے معرفت رسول کی ہو رہی ہے۔ کیا کہا: نعرف نسبه وصدقه وعفافه ''جس کے نسب کو، جس کی سچائی کو، جس کی عفت کو ہم خوب جانتے تھے''۔ فدعانا الى عبادة الله وحده ''اس نے ہمیں بلایا کہ اللہ وحدہ کی عبادت کرو''۔ لانشرک به شيئا ''اور ہم اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کریں''۔ ونخلع ما نعبد قومنا وغيره من دونه ... ''اور جس کی ہماری قوم عبادت کرتی ہے اللہ کے سوا ان سب کو اتار پھینکیں''۔ اور ہمیں معروف کا حکم دیا، منکر سے روکا، نماز کا حکم دیا، صیام کا حکم دیا، صدقہ کا، صلہ رحمی کا اور تمام اخلاق حسنہ کا۔ اور ہمارے اوپر اب یہ نبی کی معرفت ہوئی تھی'' فتلا علينا تنزيلا جاء ه من الله عزوجل لايشبه شيئا غيره ''پھر اُس نے ہمارے اُوپر ایک تنزیل کی تلاوت کی جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے آئی تھی، اس تنزیل کے مشابہ بھی کوئی شے نہیں تھی''۔ قرآن کے اعجاز کے ذریعے۔ فصدقناه وآمنا به۔ ''ہم نے اس کی تصدیق کی اور اسے مان لیا''۔ اب دیکھیں۔ رسول آئے، ہم تو غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے، رسول آئے جن کے نسب اور حسب اور عفت اور ان کے اخلاق علیا کو ہم جانتے تھے انہوں نے ہمیں کہا یہ یہ کام کرو اور معجزے کے طور پر ایسی تنزیل ہمارے اوپر تلاوت کی کہ جو کسی شے کی مانند نہیں تھی۔ ہم ایمان لے آئے۔ اب یہاں وہ عقلی دلائل کا سفر طے نہیں ہو رہا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے کہا کہ یہ دلیل حدوث دیکھو۔ بلکہ سارے سفر طے ہو گئے۔

اسی طرح ایک اور بہت خوبصورت حدیث ہے کہ کس طرح کچھ لوگ آ کر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آتے تھے۔ یہ طویل حدیث ہے، لیکن ہے بہت خوبصورت۔ یہ مسلم کی روایت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں منع کر دیا گیا کہ ہم اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کریں، کیونکہ وہ ایک آیت نازل ہو گئی تھی اور صحابہ ڈر گئے تھے: كنا نهينا ان نسئل رسول الله ﷺ فكان يعجبنا ان ياتيه رجل من اهل البادية ہمیں بڑا اچھا لگتا تھا کہ کوئی دیہات سے آدمی آ جائے جو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرے۔ فيسئله ونحن نسمع وہ پوچھے اور ہم سنیں۔ فاتى الرجل منهم تو آ گئے ایک صاحب اہل بادیہ میں سے۔ فقال يامحمد! دیکھیے جو بدو ہوتے تھے ہمیں ایسا لگتا ہے جیسے منہ پھٹ سے ہیں۔ یعنی بالکل صراحتاً آ کر بولتے تھے۔ وہ بالکل سیدھے ہوتے تھے، کوئی تصنّع، کوئی تکلّف نہیں ہے، کوئی بناوٹی پن نہیں ہے۔ ان کے سوالات دیکھیں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوالات ہونے لگے۔ کہنے لگے کہ يامحمد اتانا رسولک آپ نے ایک آدمی کو بھیجا تھا، وہ ہمارے پاس آیا۔ فزعم اس کا خیال یہ ہے۔ انک تزعم کہ آپ اپنے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ ان الله ارسلک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھیجا ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: صَدَقْتَ ''تم نے ٹھیک کہا''۔ میں نے ہی آدمی کو بھیجا تھا اُس نے ٹھیک کہا۔ پھر اس نے سوال کیا۔ قال من خلق السماء؟ پوچھا آسمان کس نے پیدا کیا؟ قال: الله، فرمایا: اللہ نے پیدا کیا''۔ اُس نے کہا: فمن خلق الارض؟ ''تو زمین کو کس نے پیدا کیا؟'' قال: الله فرمایا: اللہ نے''۔ قال فمن نصب هٰذه الجبال؟ وہ مدینہ میں تھا۔ پہاڑوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ یہ پہاڑ کس نے نصب

کیے؟ قال :اللہ ''فرمایا:اللہ نے''۔قال فمن جعل فیھا ھٰذہ المنافع؟پوچھنے لگا یہ زمین میں منافع کس نے رکھے؟ قال : اللہ ''فرمایا:اللہ نے''۔اچھا یہ ساری باتیں پوچھ لیں۔جواب مل گیا'اس کو تسلی ہوگئی۔پھر کیا کہتا ہے: فبالذی خلق السماء والارض ونصب الجبال وجعل فیھا ھٰذہ المنافع آ آللہ ارسلک؟اُس اللہ کی قسم جس نے زمین وآسمان اور پہاڑوں کو نصب کیا۔کیا اللہ نے آپ کو بھیجا ہے؟قسم دے کر پوچھ رہا ہے اس ہستی کی قسم جس نے یہ سارا کچھ پیدا کیا۔ اہلِ عرب جن کے ہاں زبان کی اہمیت ہوتی تھی'قسمیں دلا کر پوچھتے تھے تو آگے سے شریف آدمی جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ بہرحال اللہ کے نبی ﷺ نے اس کو جواب دیا:نعم ''ہاں!'' پھر وہ کہنے لگا: آپ نے جن صاحب کو بھیجا تھا ان کا خیال تھا: ان علینا خمس صلوات فی یومنا ولیلتنا ''ہم پر پانچ نمازیں فرض ہیں دن اور رات میں''۔قال :صَدَقْتَ۔اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:ان صاحب نے سچ کہا۔قال فبالذی ارسلک آللّٰہ امرک بِھٰذَا؟''اُس نے کہا:اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے' کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:نعم۔پھر اس نے پوچھا۔وزعم رسولک ان علینا صدقة فی اموالنا؟ آپ کے رسول کا خیال یہ ہے کہ ہمارے اوپر صدقہ بھی ہے ہمارے اموال میں؟قال صدق۔ قال فبالذی ارسلک آللّٰہ امرک بھٰذا؟قال نعم۔اس کے بعد وہ کہنے لگا: وہ زعم رسولک ان علینا صوم شھر فی سنتنا ''آپ کے پیغام بر کا یہ بھی خیال تھا کہ ہم ہر سال بھر میں ایک ماہ کے روزے بھی رکھیں؟''قال صدق۔قال فبالذی ارسلک آللّٰہ امرک بھٰذا؟قال نعم۔قال وزعم رسولک ان علینا حج البیت من استطع الیہ سبیلا۔قال صدق۔قال فبالذی ارسلک آللّٰہ امرک بھٰذا؟قال نعم۔ قال والذی بعثک بالحق۔چنانچہ اس نے آخر میں قسم کھائی۔''اُس اللہ کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے''۔ دیکھ لیں۔وہ بدوی آیا ہے'اُس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے۔سوالات کیے' آپ ﷺ نے جواب دیے۔اور وہ ایمان لے آیا۔اب وہ اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھا کر کہہ رہا ہے: لا ازید علیھن ولا انقص منھن۔''نہ اس پر میں کچھ اضافہ کروں گا'نہ اس میں کچھ کمی کروں گا''۔فلما ادبر ۔جب وہ صاحب چلے گئے تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:ولئن صدق لیدخلن الجنة (الاعتقاد للبیھقی)اگر اس نے سچ کہا ہے کہ یہ اس پر عمل کرے گا تو یہ جنّت میں لازماً داخل ہوجائے گا۔

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اس طرح لوگ صرف رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر آپ ﷺ کے کلام سے' آپ ﷺ کے معجزے یعنی قرآن سے جیسے حضرت جعفر کو ہم نے دیکھا،اس سے استدلال کر کے بھی ان تمام سلوک کی منازل کو طے کر لیتے تھے۔عقائد کے اس سفر کو ایک لمحے میں اللہ کے نبی ﷺ طے کروا دیا کرتے تھے۔اسی لیے بزرگ کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ کی سیرت مطہرہ کا مستقل مطالعہ بہت مفید ہے۔یہاں تک کہ اس شخص کے دل میں بھی جس کے دل میں شکوک وشبہات پیدا ہو رہے ہوں۔ہوسکتا ہے اس کو شک کا جواب دلیل سے نہ ملے'لیکن رسول اللہ ﷺ کی سنت کو اور آپ ﷺ کی سیرت کو پڑھ کر یقین کامل ہوجائے کہ یہ شخص رسول ہے۔فرماتے ہیں کہ اس طریقے پر بھی لوگ ایمان لائے ہیں۔تو ہمارے بہت سے اصحاب آنے والے لوگوں کو جو اللہ کے وجود پر پوچھنے کے لیے آئے ہیں اور دلیل طلب کریں تو کچھ اس راہ پر بھی ڈال دیتے ہیں۔تو یہ بھی طریقہ ہے۔یعنی یہ فرما رہے ہیں کہ اس میں کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ یہ متکلمین ہی کا طریقہ ہے۔لیکن فرماتے ہیں کہ اگر پھر بھی شبہ دل سے رخصت نہ ہو تو بہرحال دلیل سے بھی اس کو سمجھایا جائے گا' کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دلیل سے سمجھایا بھی ہے۔

❁❁❁

مباحثِ عقیدہ (۴)

آج ہم امام بیہقی علیہ الرحمہ کی کتاب کے تیسرے باب کا آغاز کریں گے۔جس کا عنوان ہے: ذکر اسماء اللہ وصفاتہ۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء وصفات کا بیان۔عزّت اسماءہ' بہت بلند ہیں' بہت عزیز ہیں' بہت نادر ہیں اللہ کے اسماء' وجل ثناءہ' اور بہت جلیل ہے اس کی ثناء اس کی مدح۔امام بیہقی علیہ الرحمہ سب سے پہلے تین آیات کے ذریعے استدلال کرتے ہیں کہ جن میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کا ذکر ہے۔اگرچہ قرآن مجید میں یہ چار آیات ہیں جن میں ''الاسماء الحسنیٰ'' کا لفظ آیا ہے۔پہلی آیت سورۃ الاعراف کی آیت ۱۸۰ ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ﴾

''اللہ کے لیے بہترین نام ہیں تو ان کے ذریعے اللہ کو پکارا کرو۔اور جو لوگ اللہ کے اسماء میں الحاد کرتے ہیں ان کو چھوڑ دو۔''

دوسری آیت ہے سورۃ الاسراء (بنی اسرائیل) کی آیت ۱۱۰۔فرمایا:

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ﴾

''اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو۔جس نام سے بھی پکارو گے تو پس اسی کے ہیں اسماء حسنیٰ۔''

تیسری آیت بھی بہت خوبصورت ہے۔سورۃ طٰہٰ کی ابتدائی آیات میں سے۔فرمایا:

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝۸﴾

''وہ اللہ ہے' اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔اُسی کے ہیں تمام اچھے نام۔''

اور چوتھی آیت سورۃ الحشر کی آخری آیت (آیت ۲۴) ہے:

﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾

''وہی ہے اللہ' تخلیق کا منصوبہ بنانے والا' وجود بخشنے والا' صورت گری کرنے والا۔تمام اچھے نام اُسی کے ہیں۔اُسی کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔''

اسی طریقے پر ایک حدیث' جو امام بخاری علیہ الرحمہ نے نقل کی' وہ حدیث بھی یہاں بیان فرماتے ہیں۔نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ اِسْمًا مِائَةً اِلَّا وَاحِدًا))

''بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ننانوے نام ہیں' سو سے ایک کم۔''

گویا اس کے ذریعے اللہ کے نبی ﷺ تاکید فرما رہے ہیں کہ ننانوے سے مراد ننانوے ہے' کوئی مجازاً نہیں کہہ رہے۔یعنی کئی دفعہ عدد عربی زبان میں مجاز کے لیے بھی آجاتا ہے لیکن اگر اس عدد کے بعد کوئی ایسی بات آجائے جس کے ذریعے وہ عدد مزید موکد ہو جائے تو اس سے مجاز کا پہلو رفع ہو جاتا ہے۔جیسے مثال کے طور پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۝۱۴۷﴾ (الصّٰفّٰت) ''ہم نے اُس (یونس علیہ السلام) کو ایک لاکھ آدمیوں کی طرف بھیجا یا اس سے کچھ زیادہ تھے''۔اب ایک لاکھ مجازاً بھی ہو سکتا ہے لیکن اَوْ يَزِيْدُوْنَ کہہ کر جو ایک لاکھ کے اندر احتمالِ مجاز ہو سکتا تھا اس کو رفع کر لیا۔تو یہ قرآن مجید کا اسلوب ہے کہ ''اَوْ'' کہہ کر یا آگے مزید تاکید فرما کر رفع احتمالِ مجاز ہو جاتا ہے۔تو یہاں بھی اللہ کے نبی ﷺ

فرمارہے ہیں: ننانوے۔ کچھ ویسے ننانوے نہیں کہہ دیا مِائَۃً اِلَّا وَاحِدًا۔ سو سے ایک کم۔ اور پھر فرمایا: ((مَنْ اَحْصَاھَا دَخَلَ الْجَنَّۃَ)) ''جس نے اس کا احصاء کیا وہ جنّت میں داخل ہو جائے گا'' یعنی جس نے ان اسماء کو شمار کیا' حفظ کیا' عمل کیا یا قرآن مجید کی تلاوت کر کے ان کا احصاء کیا یا ان کو اپنے خلق (اخلاق) کا حصہ بنایا۔ یہ تمام تفسیریں اس کی کی گئیں ہیں۔

کیا اللہ کے نام ننانوے میں محصور ہیں

اس حدیث میں لغت اور نحو کا ایک مسئلہ ہے کہ بعض علماء نے جن کی تعداد تھوڑی ہے' کہا کہ اللہ کے ننانوے ہی نام ہیں' لیکن اکثر علماء کی رائے یہی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نام ننانوے میں محصور نہیں ہیں' بلکہ ترمذی کی حدیث میں یہ ننانوے نام آئے ہیں اگرچہ وہ حدیث ضعیف ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ جس حدیث میں ننانوے کا ذکر آیا وہ حدیث تو صحیح ہے' لیکن تفصیل میں جو ہم پورے ننانوے نام پڑھتے ہیں وہ بخاری کی حدیث میں نہیں ہیں بلکہ ترمذی کی حدیث میں ہیں۔ اور علماء و محدثین کا خیال یہ ہے کہ وہ راوی نے اپنی طرف سے گن کر بیان کیے ہیں۔ راوی نے اس کا احصاء کیا۔ وہ اللہ کے نبی ﷺ کا بیان نہیں ہے' بلکہ اللہ کے نبی ﷺ کا بیان اتنا ہے کہ ننانوے نام ہیں' سو سے ایک کم' جس نے شمار کیا داخل ہوا جنّت میں۔ اب جو غلطی لگی نحو کے اعتبار سے جو ہمارے علماء نے کہا کہ (ان للہ تسعۃ وتسعین اسمًا)) للہ جار اور مجرور ہے اور جار اور مجرور کا تقدم حصر کا مفہوم پیدا کرتا ہے۔ تو یہاں یہ بھی ہوسکتا تھا کہ یہ مفہوم نکال لیا جائے کہ اللہ کے صرف ننانوے نام ہیں' لیکن علماء نے کہا کہ خبر ''للہ'' نہیں ہے کہ اللہ کے ننانوے ہی نام ہیں' بلکہ خبر یہ ہے کہ اللہ کے ننانوے نام ایسے ہیں کہ جس نے ان کا شمار کیا وہ جنّت میں داخل ہو جائے گا۔ تو گویا ننانوے ناموں کے احصاء اور شمار پر جنّت کی خوشخبری ہے۔ یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ ننانوے ہی نام ہیں کہ جن کے احصاء پر انسان جنّت میں داخل ہو جائے گا۔

بہرحال معلوم یہ ہوا کہ اللہ کے بہت سے اسماء تو ایسے ہیں جو ہم جانتے ہی نہیں ہیں۔ اور وہ حدیث سب جانتے ہیں اور یہ وہ روایت ہے جس کے بارے میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ((یَنْبَغِیْ لِمَنْ سَمِعَھُنَّ ای ھٰذہ الکلمات اَنْ یَتَعَلَّمَھُنَّ وَیُعَلِّمَھُنَّ)) ''جو ان کلمات کو سنے اس پر لازم ہے کہ ان کو سیکھے اور سکھائے'' —— وہ مشہور حدیث ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُکَ' وَابْنُ عَبْدِکَ' وَابْنُ اَمَتِکَ' نَاصِیَتِیْ بِیَدِکَ' مَاضٍ فِیَّ حُکْمُکَ' عَدْلٌ فِیَّ قَضَاؤُکَ))

''اے اللہ! بے شک میں تیرا بندہ ہوں' تیرے بندے کا بیٹا اور تیری باندی کا بیٹا۔ میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے' میری ذات پر تیرا ہی حکم چلتا ہے' میری ذات کے متعلق تیرا فیصلہ عدل وانصاف والا ہے۔''

((اَسْاَلُکَ بِکُلِّ اسْمٍ ھُوَ لَکَ' سَمَّیْتَ بِہٖ نَفْسَکَ' اَوْ عَلَّمْتَہٗ اَحَدًا مِنْ خَلْقِکَ' اَوْ اَنْزَلْتَہٗ فِیْ کِتَابِکَ' اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِہٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ))

''میں تجھ سے تیرے ہر اُس نام کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں' جس کو تو نے اپنے لیے خود تجویز کیا' یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو وہ نام سکھایا' یا اسے اپنی کتاب میں نازل فرمایا' یا اپنے پاس علم غیب میں ہی اسے محفوظ رکھا۔''

اس کی دلیل وہ حدیث بھی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن جو حمد کا جھنڈا ہوگا وہ میرے ہاتھ میں ہوگا:

((اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَلَا فَخْرَ' وَبِیَدِی لِوَاءُ الحمدِ ولا فخر)) (سنن الترمذی)

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے اوپر ایسے محامد (اللہ کی حمد کے ایسے دروازے) اور ایسے ترانے اور ایسے اسماء کھولے جائیں گے جو اَب میں نہیں جانتا''۔ تو پتہ چلا کچھ نام ایسے ہیں جو اللہ نے اپنے لیے خود رکھے ہیں' کچھ کتاب میں نازل کر دیے ہیں' کچھ اپنے پاس خاص کر لیے ہیں۔ چنانچہ اللہ کے بہت سے نام ایسے ہیں جو ہم ابھی نہیں جانتے۔ اور پھر مانگا کیا

ہے تمام ناموں کا واسطہ دے کر:

((اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجِلَاءَ حُزْنِیْ وَذَهَابَ هَمِّیْ))(السلسلة الصحیحة:۱۹۹)

''کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے غم میں روشنی اور میری پریشانی کی دوری کا ذریعہ بنا دے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی شخص کو جب کبھی کوئی غم اور دکھ لاحق ہو اور وہ یہ (کلمات) کہہ لے تو اللہ تعالیٰ اس کا غم اور دکھ دور کر دیں گے اور اس کی جگہ کشادگی پیدا کر دیں گے۔ کسی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم اس دعا کو سیکھ نہ لیں؟ فرمایا: کیوں نہیں، جو بھی اس دعا کو سنے اس کے لیے مناسب ہے کہ اسے سیکھ لے۔''

اسی طرح ایک اور بہت خوبصورت حدیث ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ آپ مجھے اسم اعظم سکھا دیں۔ وہ اسم اعظم جس کے ذریعے پکارا جائے تو اللہ دعا رد نہیں کرتے۔ تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ تم دعا مانگو، آپ ﷺ نے اسم نہیں بتایا بلکہ کہا تم دعا مانگو اور وفقک اللہ اللہ تجھے صحیح دعا مانگنے یعنی اسم اعظم تک پہنچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ سیدہ عائشہؓ نے دو رکعت نماز پڑھی اور اس کے بعد یہ دعا مانگی: اللھم انی اسئلک بکل اسم ھو لک ما اعلم وما لا اعلم ''اے اللہ میں تیرے ان تمام اسماء کے ذریعے سوال کرتی ہوں، جانتی ہوں یا نہیں جانتی۔'' اسئلک باسمک العظیم الاعظم ''میں تجھ سے تیرے العظیم الاعظم نام کا واسطہ دے کر سوال کرتی ہوں۔'' الکبیر الاکبر جو الکبیر ہے الاکبر ہے۔ الذی من دعاک به اجبته ومن سألک به اعطیته ''وہ نام جس کے ذریعے کوئی تجھے پکارے تو تُو جواب دیتا ہے اور جس نام کا واسطہ دے کر تجھ سے مانگا جائے تو تُو عطا فرماتا ہے''۔ تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا سیدہ عائشہ سے کہ وفقت یعنی تجھے توفیق مل گئی کہ تُو نے اسم اعظم کے ذریعے پکار لیا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو۔ (الاسماء والصفات للبیهقی)

بہرحال اب تک کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جو اسماء حسنیٰ حدیث میں آئے ہیں وہ ننانوے میں محصور نہیں ہیں اور جو حدیث میں ننانوے نام ہم پڑھتے ہیں وہ اکثر محدثین کے ہاں کسی راوی کا قول ہے، اللہ کے نبی ﷺ کی طرف اس کی نسبت درست نہیں ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ کی طرف اتنی نسبت ثابت ہے کہ یہ اسماء حسنیٰ ننانوے ایسے ہیں کہ جو ان کا شمار کرے گا وہ جنّت میں داخل ہو جائے گا۔

مسئلہ اسم اعظم

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا اللہ کا کوئی اسم اعظم ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہے! کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمادیا کہ ایک ایسا اسم ہے جس کے ذریعے پکارا جائے تو اللہ تعالیٰ پکار کا جواب دیتا ہے۔ اب وہ اسم اعظم کیا ہے؟ اس کے ضمن میں بہت سے اقوال آپ پڑھیں گے، روایات میں بھی اور علماء کے بھی کچھ اقوال ہیں۔ ان سب کا خلاصہ دیکھا جائے تو وہ چار اقوال میں ہے۔ (۱) ایک اسم اعظم ہے۔ (۲) ایک سے زیادہ اسم اعظم ہیں۔ (۳) ایک اسم اعظم ہے اور پکارنے والا ایک خاص حالت یا کیفیت کے ساتھ پکارے۔ (۴) ایک سے زیادہ اسم عظمیٰ ہیں اور پکارنے والا ایک خاص کیفیت کے ساتھ پکارے۔ جیسے سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کا قول یہ ہے کہ اللہ کا اسم اعظم ''اللہ'' ہے، اسم ذات، لیکن پکارا اس کو اس طرح جائے کہ پکارتے وقت اللہ کے سوا واقعی دل میں کوئی حاضر نہ ہو تو اسم اعظم بنے گا۔ اور اگر ''یا اللہ'' کہتے ہوئے غیر اللہ دل میں حاضر ہے تو محض یہ کلمات اسم اعظم کا کام نہیں دیں گے۔ اسی طریقے پر امام غزالی علیہ الرحمہ کا خیال بھی کچھ اس طرح ہے کہ جو اسم اعظم ہے وہ مختلف اسماء کا مجموعہ ہے، ایک اسم نہیں ہے۔ بلکہ جیسے بعض نے کہا: ''یاحی یاقیوم'' ہے اور بعض نے ایک حدیث کی بنا پر کہا۔ وہ حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک صاحب کو ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگتے دیکھا: ((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ اَنِّیْ اَشْهَدُ اَنَّکَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَهٗ

كُفُوًا اَحَدٌ)) (سنن ابی داؤد :۲/ ۱۸۰) تو آپؐ نے فرمایا: ''اس نے اسم اعظم کے ذریعے سے دعا مانگی ہے''۔ اس میں کچھ اسماء آ رہے ہیں' صمد بھی ہے' اللہ بھی ہے۔ تو امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اس طرح اسماء کا مجموعہ ہو اور پھر مانگتے وقت نہ سبب پر اعتماد ہو نہ سبب پر نگاہ ہو' نہ دل غفلت کی حالت میں ہو' اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی محبّت اور اس کی عظمت سے سرشار ہو تو یہ اسم اعظم بن جائے گا۔ تو اسم اعظم کے حوالے سے یہ بات واضح رہنا چاہیے کہ حتمی طور پر ہمیں نہیں معلوم' لیکن اکثر صوفیاء کرامؒ کا خیال یہ ہے کہ جو اسم ذات ہے وہی اسم اعظم ہے۔ وہ اسم ذات کیا ہے: اللہ!

اسم ذات اور اسم صفت میں فرق

ہم اب اس موضوع سے اگلے موضوع پر منتقل ہو رہے ہیں کہ اسم ذات کیا ہے؟ یعنی کیا اللہ کا کوئی اسم ذات ہے؟ اسم ذات اور اسم صفت میں فرق کیا ہے؟ دیکھیں جو لفظ اللہ ہے کچھ لوگ اس کو مشتق کہتے ہیں۔ عربی زبان میں کچھ نام ہوتے ہیں مرتجل' جو ابتداءً کسی شے کے رکھ دیے جاتے ہیں' کسی شے سے ان کا اشتقاق نہیں ہوتا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے مشتقات بہت سارے ہیں' اسم فاعل' اسم مفعول' صفت مشبہ وغیرہ۔ جیسے رجل ہے' آپ نے کسی کا نام رکھ دیا' مشتق نہیں ہے۔ شجر مشتق نہیں ہے' نام رکھ دیا گیا ایک شے کا' یہ اسم ذات ہے۔ تو جن لوگوں نے کہا کہ لفظ اللہ مشتق ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ اسم ذات نہیں ہے بلکہ یہ بھی اسم صفت ہے' کیونکہ مشتقات صفات بنتی ہیں۔ جیسے ہم اللہ کے نام پڑھتے ہیں: خالق' رازق' مالک سب اسم الفاعل کے وزن پر آ رہے ہیں اور یہ مشتقات ہیں۔ اسی طرح اسم ''اللہ'' کسی اور لفظ سے نکالا گیا۔ اس بارے میں تین چار آراء ہیں: الٰہ سے ہے' وَلَہ سے ہے' اس میں ہم نہیں جا رہے۔ لیکن زیادہ علماء کی رائے یہ ہے' جس میں کچھ بڑے بڑے نحوی بھی ہیں' جیسے عثمان بن قمر سیبویہ جس کو آپ الامام سیبویہ کے نام سے جانتے ہیں' جن کی ''الکتاب'' ہے لغت پر۔ تو وہ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ مشتق نہیں ہے' کیونکہ اگر مشتق ہوتا تو اس پر جو الف لام آ رہا ہے تو یہ یا پکارتے وقت گرنا چاہیے۔ مثلاً انہوں نے ایک دلیل دی کہ آپ ''الرَّحْمٰن'' کے ساتھ ''یا'' لگاتے ہوئے ''یا الرَّحْمٰن'' تو نہیں کہہ سکتے' آپ نے لازماً الف لام گرا دینا ہے' یارحمان کہیں گے۔ الرحیم ہے تو پکارتے وقت یارحیم کہیں گے۔ اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے باقی اسماء ہیں' لیکن یااللہ میں جو الف لام آ رہا ہے وہ الف لامِ بالمعرفہ نہیں ہے بلکہ یہ تو اسم کا جزو ہے' کیونکہ مشتق والوں نے کہا تھا الٰہ کے اوپر الف لام لگا دیا الالٰہ' پھر کثرتِ استعمال سے اللہ ہو گیا۔ اس میں ال الف لام معرفہ ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ الف لام معرفہ نہیں ہے' ورنہ تو اصول یہی ہے کہ یااللہ نہیں ہونا چاہیے۔ تو وہ فرماتے ہیں کہ یہ مشتق نہیں ہے بلکہ مرتجل ہے۔ اسی طرح دوسرے بڑے نحوی سیدنا مبرّد جن کی ''الکامل فی الادب'' ہے۔ انہوں نے بھی یہی فرمایا کہ یہ مشتق نہیں ہے بلکہ مرتجل ہے۔

خلیل بن احمد الفراہیدی علم العروض (بحور کا علم) کے بانی یعنی دریافت کرنے والے سمجھے جاتے ہیں اور سب سے پہلی جو عربی زبان میں قاموس لکھی گئی ہے جس کو ''العین'' کے نام سے جانا جاتا ہے وہ بھی خلیل بن احمد الفراہیدی کی ہے' ان سے دو روایات مروی ہیں' لیکن زیادہ قوی روایت یہ ہے کہ یہ مشتق نہیں ہے۔ اسی طریقے پر ہمارے کچھ بڑے ائمہ جنہوں نے اسماء اللہ الحسنیٰ کی شرح میں کتابیں لکھی ہیں' ان میں سب سے بڑا نام امام غزالی کا ہے' جن کی کتاب ہے: المقصد الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ اور یہ بہت زبردست کتاب ہے' اس کو ضرور پڑھنا چاہیے' تو وہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ مشتق نہیں ہے' یہ اللہ تعالیٰ کا اسم ذات ہے۔ انہی کی پیروی فرمائی ہے بعد میں امام رازی علیہ الرحمہ نے کہ جنہوں نے ایک کتاب تحریر کی اور یہ پچھلے دنوں ہی میرے علم میں آئی اور میں نے اس کا مطالعہ شروع کیا تو اس کو بھی بہت ہی زیادہ مفید پایا۔ وہ کتاب ہے: لوامع البیّنات فی شرح اسماء اللہ والصفات۔ وہ بھی اسی طرف گئے ہیں' اگرچہ متکلم ہیں صوفی نہیں ہیں۔ ویسے صوفی بھی ہیں' لیکن ان پر شہرت متکلم ہونے کی غالب ہے۔ تو وہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ اسم ذات ہے' مشتق نہیں

ہے۔اسی طرح اور بھی بہت سے علماء ہیں۔بہرحال زیادہ قوی رائے (واللہ اعلم!) یہی محسوس ہوتی ہے کہ اللہ کا جو اسم ذات ہے، جس کی دلالت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پر ہے وہ لفظ اللہ ہے اور باقی جو اسماء ہیں وہ صفاتی نام ہیں۔صفاتی نام کا مطلب ہے کہ ان میں بھی ذات پر دلالت ہے لیکن ایک خاص صفت کو ملحوظ رکھ کے۔یعنی جب ہم کہتے ہیں ''خالق'' تو ہم اللہ کی ذات پر بھی دلالت کر رہے ہیں کہ خالق جو خلق کرنے والا ہے لیکن ایک صفت کو پیش نظر رکھ کر جو کہ صفت خلق ہے۔اسی طریقے پر جب ہم کہتے ہیں الرحیم 'الرزاق 'التواب 'الوھاب 'الغفور 'الرحیم وغیرہ۔تو یہ سب نام اللہ تعالیٰ کی ذات پر دلالت کرتے ہیں۔لیکن یہ مجرد ذات پر دلالت نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک صفت کو پیش نظر رکھ کے کر رہے ہیں۔اس کی ایک اور بہت خوبصورت دلیل دی مختلف علماء نے کہ ہم کہتے ہیں کہ اللہ کے نام ہیں، ہم یہ نہیں کہتے کہ الرحیم کے نام ہیں، بہت سے۔یعنی اللہ کا نام الرحیم ہے، ہم یہ نہیں کہتے الرحیم کا نام اللہ ہے۔تو اللہ کی طرف تمام اسماء حسنیٰ کی نسبت کی جاتی ہے، کسی اور اسم کی طرف اسماء کی نسبت نہیں کی جاتی۔

شرح اسماء اللہ الحسنیٰ میں چند بہترین کتابوں میں سے سب سے پہلی کتاب خود امام بیہقی علیہ الرحمہ کی ہے اور وہ ہے: الاسماء والصِفات۔اس میں ہر اسم پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔پھر امام الغزالیؒ کی کتاب ہے: المقصد الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ۔اسی نام سے امام قرطبیؒ کی بہت ضخیم کتاب ہے، وہ امام غزالی کی کتاب سے کافی ضخیم کتاب ہے، اس میں بس المقصد نہیں ہے، اس کا نام ہے: الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ۔چوتھی کتاب امام رازیؒ کی کتاب ہے: لوامع البینات فی شرح اسماء اللہ والصفات۔پھر اور بھی بہت سی کتابیں ہیں۔موریطانیہ کے ایک بہت بڑے مجدد اور صوفی شیخ تھے سید احمد زروق، ان کی بھی ایک کتاب ہے: شرح اسماء اللہ الحسنیٰ۔اسی طرح اردو زبان میں بھی یقیناً بہت سی کتابیں ہوں گی، لیکن ایک مشہور کتاب ہے سید سلیمان منصور پوری کی: شرح اسماءِ حسنیٰ۔اسی طرح مولانا موسیٰ روحانی بازی کی کتاب بھی اس موضوع پر موجود ہے۔واللہ اعلم!

قدم اسماء

اس سے اگلا موضوع ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء حسنیٰ سب کے سب قدیم ہیں۔قدیم سے مراد ہے کہ اسماء کے مسمیات قدیم ہیں، ان کے معانی، ان کے مدلولات قدیم ہیں۔یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیشہ سے ان تمام صفات سے متصف ہیں۔امام طحاویؒ کے عقیدے کی عبارت یہ ہے کہ لم یزل بصفاته قدیما اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیشہ سے یہ صفات رکھتے ہیں۔یہ کیوں بتانا چاہ رہے ہیں، میں مختصر وضاحت ابھی کر دیتا ہوں۔اسی طرح عقیدہ طحاویہ ہی کی عبارت ہے: لم یزدد بکونهم شیئا لم یکن قبلهم من صفاته یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کامل ذات ہیں، وہاں کسی قسم کی کوئی احتیاج نہیں ہے، غنائے مطلق ہے۔کچھ تصورات ایسے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بھی شاید تدریجاً اپنے آپ کو کامل فرما رہا ہے، کائنات کے ذریعے، مخلوقات کے ذریعے۔تو (نعوذ باللہ) خدا کمال کا سفر طے کر رہا ہے۔جب کہ خدا وہ ہے ہی نہیں جو کمال کا سفر طے کرے، خدا وہ ہے جو کمال مطلق رکھتا ہے، کسی اور کی حاجت نہیں رکھتا، کسی غیر کی حاجت نہیں رکھتا۔لہٰذا اگر اس کا کمال یا اس کی کوئی صفت موقوف (dependent) ہوئی مخلوق کے پیدا کرنے پر تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے غیر کے محتاج ہو گئے۔نعوذ باللہ! یعنی ہم یہ فرضیہ گفتگو کر رہے ہیں اور اگر ایسا ہو گیا تو وہ خدا نہ ہوا۔یعنی خدا وہ نہیں ہے جو کسی غیر کا محتاج ہو۔تو ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کر کے کچھ حاصل کرتے ہیں۔نہ ان کی صفات میں مزید کمال آتا ہے۔نعوذ باللہ! یا ان کی کچھ صفت ایسی پیدا ہو جاتی ہے کہ جو پہلے نہیں تھی مخلوق کے واسطے سے۔تو امام طحاویؒ فرماتے ہیں یہ سب باطل ہیں، اللہ تو غنی ہے۔اللہ فرماتا ہے:

﴿قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي

الْاَرْضِ جَمِیْعًا ؕ﴾ (المائدۃ:۱۷)

''تو ان سے پوچھئے کون ہے جسے اختیار ہو اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی اگر وہ ہلاک کرنا چاہے مسیحؑ ابن مریم کو اور اُس کی ماں کو اور جو زمین میں ہیں ان سب کو!''

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۶﴾ (العنکبوت) ﴿اِنْ تَکْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا فَاِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۸﴾ (ابراھیم) ﴿وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ ؕ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۱۲﴾ (لقمان)

یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ غنائے مطلق رکھتے ہیں۔ اسی لیے آپ دیکھیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے کسی درجے میں عقیدے کی سطح پر فقر ثابت کر دیا تو اسی درجے میں اللہ سے تعلق میں کمی آ جائے گی۔ کیونکہ ہمارا اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے تعلق کیا ہے؟ اللہ غنائے مطلق رکھتا ہے، وہ غنی مطلق ہے اور ہم فقیر مطلق ہیں۔ اگر وہ غنی مطلق نہ رہے تو ہمارا فقر بھی مطلق نہیں رہے گا۔ اور عجیب بات ہے ایک بڑے متکلم نے اس طرح فرمایا کہ وہ گمراہ فرقے جن کے خیال میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے اس درجے کے غنا کا اثبات نہیں ہے جس درجے کے غنا کا اثبات کیا گیا ہمارے عقیدے میں، قرآن وحدیث میں اور دلائل کے ذریعے تو ان فرقوں میں اسی درجے کچھ تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔ فردِ واحد کی بات نہیں ہو رہی، ایک پوری جو چھاپ بنتی ہے۔ وہ کیوں؟ اس لیے کہ جہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں کچھ درجے کی احتیاج ثابت ہوتی ہے اسی درجے کی احتیاج یہاں سے رخصت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایسی ذہنیت یوں بنے گی جس میں اللہ تعالیٰ سے تعلق میں وہ فقر نہیں رہے گا کہ جو ملحوظ خاطر رہنا چاہیے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿فَقَالَ رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ۲۴﴾ (القصص)

''تو موسیٰؑ نے دُعا کی: پروردگار! جو خیر بھی تُو میری جھولی میں ڈال دے مَیں اس کا محتاج ہوں۔''

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ ۚ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۱۵﴾ (فاطر)

''اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو، اور اللہ تو الغنی اور الحمید ہے۔''

''انتم الفقراء'' یہ بھی حصر ہے۔ اے انسانو! تم ہی فقیر ہو۔ اگرچہ غیر بھی فقیر ہے، اس کو لغت میں حصر اضافی کہتے ہیں۔ ''انتم الفقراء'' یعنی تم اتنے فقیر ہو کہ شاید تمہارے سوا کوئی فقیر ہی نہیں ہے۔ اس میں کیوں حصر پیدا ہوا؟ ''انتم'' اور ''الفقراء'' کیونکہ دونوں معرفہ ہیں۔ انتم ضمیر ہے تو یہ بھی معرفہ ہے اور الفقراء بھی معرفہ ہے اور اگر مبتدا اور خبر دونوں معرفہ آ جائیں تو پھر حصر پیدا ہو جاتا ہے۔ تو ''انتم الفقراء'' کا مطلب یہ ہے کہ تم ہی فقیر ہو۔ اب دیکھیں وہاں بھی یہی اسلوب آ گیا: ﴿وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ﴾ ''اور اللہ ہی غنی اور حمید ہے''۔ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی تمام صفات کے ساتھ قدیم ہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ غنی مطلق ہیں، اللہ کے ہاں احتیاج کسی درجے میں نہیں ہے۔ اور جب تک آپ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو اس عقیدے کے تحت نہیں مانتے آپ اللہ پر اس طرح نچھاور بھی نہیں ہو سکتے، آپ اللہ سے وہ تعلق پیدا نہیں کر سکتے جو تعلق پیدا کرنا دین کا مقصود ہے۔ اسی لیے عقیدے کی درستگی اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہوتی ہے۔ جیسے امام غزالیؒ نے جب فلاسفہ کا رد کیا تو فلاسفہ اس بات کے قائل تھے کہ خدا سے عالم کا صدور ایجاب کے تحت ہوتا ہے، اختیار کے تحت نہیں ہوتا۔ ہونا ہی ہونا ہے۔ جس طرح سورج سے شعاع نکلے گی، علت سے معلول پیدا ہوگا اگر علت کاملہ ہوگی۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کا خدا سے تعلق وہ نہیں ہو سکتا جن کے ہاں خدا اس کائنات کو پیدا کرنے میں مختار نہیں ہے۔ اس سے ہونی ہی تھی پیدا۔ وہاں اختیار نہیں تھا۔ فرماتے ہیں جو یہ مانتا ہے کہ اللہ چاہتا تو پیدا کرتا، نہ چاہتا تو نہ پیدا کرتا۔ ﴿اِنْ یَّشَاْ یُذْھِبْکُمْ﴾ چاہتا

تو تمہیں لے جاتا' چاہتا تو پیدا ہی نہ کرتا۔ تو وہ تعلق جو اس عقیدے کے تحت اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے پیدا ہوگا وہ اس عقیدے کے تحت نہیں ہوسکتا جس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو یہ مان لیا جائے کہ اللہ نے کرنا ہی کرنا ہے' جہاں اللہ پر کچھ واجب قرار دے دیا جائے۔ جیسے معتزلہ نے اللہ پر کچھ چیزوں کو واجب قرار دے دیا تھا کہ اللہ پر یہ یہ شے واجب ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھیے' کیونکہ عقیدہ پڑھنے کا مقصد یہ تو نہیں ہے کہ ہم اس کو دماغ میں بٹھالیں۔ اصل مقصد اللہ سے تعلق ہے۔ تو اللہ سے تعلق کے لیے بھی گویا اللہ کو صحیح پہچاننا ضروری ہے۔ تو بس یہ باتیں اللہ کو صحیح پہچاننے کے لیے ہیں' باقی تعلق تو اس کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ یہ پہچاننا ضروری ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مخلوق سے کچھ نہیں لیتے' صرف دیتے ہیں اپنے اختیار کے تحت۔

کمال صفات کا بالقوۃ ہونا ہے نہ کہ بالفعل

اس سے جو اگلا مسئلہ فروعی پیدا ہوا' وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق پیدا کی تو خالق ہوا۔ یعنی رازق کے لیے مرزوق چاہیے جس کو رزق دیا جائے گا۔ اور غفور کے لیے مغفورٌ لہ چاہیے۔ عفو کے لیے معفوعنہ چاہیے' وغیرہ۔ تو اللہ کے کچھ اسماء افعال ہیں جن کے لیے سامنے کوئی وجود چاہیے۔ تو اللہ خالق اسی وقت بنے گا جب پیدا کرے گا۔ اللہ رازق اسی وقت بنے گا جب کسی کو رزق دے گا۔ تو یہ رازق ہونا کیا اللہ کی صفت کمال نہیں ہے؟ خالق ہونا کیا اللہ کی صفت کمال نہیں ہے؟ تو یہ تو مخلوق کی پیدائش پر منحصر ہے۔ مخلوق کے وجود پر تو تم نے ابھی یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ تو مخلوق سے کچھ حاصل نہیں کرتا۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے کمال مخلوق کے پیدا کرنے کی قدرت ہونا ہے۔ اللہ کے لیے کمال مخلوق کو رزق دینے کی قدرت ہونا ہے۔ بالفعل دے دینا اللہ کا کمال نہیں ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھیے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کائنات پیدا نہ فرماتے تو کائنات پیدا فرمانے کی قدرت تو اللہ کو ہے۔ پیدا فرما کے رزق دینے کی قدرت تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ہے۔ رزق دینے کی' معاف کرنے کی سزا دینے کی' انتقام لینے کی' عذاب دینے کی تمام قدرتیں حاصل ہیں۔

یہ قدرت ازل سے اللہ کو حاصل ہے اور یہی قدرت اللہ کے کمال کا محل ہے۔ بالفعل پیدا کر دینا اللہ کے لیے کمال نہیں ہے' یہ بس اللہ کی رحمت کا ظہور ہے۔ تو جب آپ سلف کی عبارت پڑھتے ہیں: لم یزل خالقا' لم یزل رازقا ہمیشہ سے اللہ خالق ہے' ہمیشہ سے اللہ رازق ہے' تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ سے اللہ قادر ہے علی الرزق' قادر ہے علی الخلق قادر ہے علی المغفرت۔ مخلوق کو پیدا کرنے سے اس کی صفات میں اضافہ نہیں ہو رہا۔ تو اس طریقے پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ غنی مطلق ہے۔ تو اللہ ''المالک'' ہے' اس لیے کوئی شے اس کی مملکت سے نکل نہیں سکتی۔ اس کو بار بار اس لیے دہرا رہا ہوں کہ اس وقت ہمارے ہاں بعض فرقے ایسے موجود ہیں جن کے عقائد میں اس طرح کی باتیں موجود ہیں کہ جس کے نتیجے میں یہ لازم آتا ہے کہ اللہ کے لیے مخلوق کا پیدا کرنا ضروری ہے۔ اور اگر اللہ مخلوق پیدا نہیں کرتا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات کمال اپنا ظہور نہیں کر پاتیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ ناقص رہتا ہے۔ لہٰذا اس بنیاد پر کچھ لوگ قدم کے قائل ہو گئے۔ کچھ فلاسفہ تو مادہ کے قدم کے قائل ہیں اور کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی نسبت تو بزرگوں سے ہی جوڑتے ہیں لیکن وہ بھی اس کے قائل ہو گئے کہ کبھی ایسا وقت نہیں آیا کہ اللہ کے ساتھ کوئی مخلوق نہ ہو۔ بخاری کی حدیث ہے: ((کان اللہ ولم یکن شیء غیرہ)) اللہ تعالیٰ کے لیے جب ہم یہ لفظ بولتے ہیں کہ اللہ پر ایسا وقت نہیں آیا تو یہ سب ہمارے مجازی الفاظ ہوتے ہیں' اس لیے کہ ہماری زبان محدود ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ زمان میں ہے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ زمان ومکان کے خالق ہیں' ان پر نہ ابھی کوئی وقت گزر رہا ہے نہ پہلے کبھی گزرا ہے' وہ اس قسم کی تمام تحدیدات سے ماوراء ہیں۔ آپ کہیں پھر کیا ہے؟ تو یہی تو اللہ تعالیٰ بتا رہا ہے: ﴿لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ﴾ اس کی مانند کوئی نہیں ہے۔ آپ کہیں گے ایسی ہستی کے بارے میں ہم نے سنا ہی نہیں۔ نہیں سنا تو یہی تو اللہ

تعالیٰ بتا رہے ہیں: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ، هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ، وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾۔ اگر وہ کسی مخلوق کی مانند ہو جاتا تو پھر مخلوق نہ ہو جاتا؟ وہ تو خالق ہے' وہ تو الخالق ہے۔

ان ساری باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی ذات وصفات میں کامل ہیں اور اپنی ذات وصفات میں کسی اور کے محتاج نہیں ہیں۔ مخلوق پیدا کرنے سے اللہ کی صفت کمال میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی قسم کی کوئی احتیاج نہیں ہے۔ جس طرح ہم سراپا احتیاج ہیں' سراپا فقر ہیں' سراپا مفلس ہیں' اسی طریقے پر اللہ سراپا غنی ہے اور عزیز ہے اور اپنی صفات میں کامل ہے۔

صفاتِ ذات اور صفاتِ افعال کا فرق

ایک ہوتی ہے صفتِ ذات' ایک ہوتی ہے صفتِ فعل' ان میں کیسے فرق کیا جاتا ہے؟ اس پر علماء کا بہت طویل کلام موجود ہے کہ کیسے فرق کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک عالم سے یہ سادہ سی بات معلوم ہوئی جس سے ہم عموماً فرق سمجھا سکتے ہیں۔ صفت ذات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وہ ہوتی ہے جس کی ضد آپ فرض نہیں کر سکتے اور صفت فعل وہ ہوتی ہے کہ جس کی ضد بھی اللہ کی صفت ہوتی ہے۔ یعنی مثال کے طور پر اللہ کی صفت العلیم ہے لیکن اس کی ضد جہالت ہم فرض نہیں کر سکتے۔ یہ صفت ذات ہے۔ لیکن اگر ہم کہیں مُحْیِی (زندہ کرنے والا) ہے تو مُمِیت بھی ہے۔ مُعِز ہے تو مُذِل بھی ہے' قابض ہے تو باسط بھی ہے' رازق ہے تو قابض بھی ہے۔ لے بھی لیتا ہے تو وہ تمام صفات جس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ دونوں کام فرماتے ہیں وہ صفاتِ فعل ہوتی ہیں اور جہاں آپ یہ دو چیزیں فرض نہ کر سکیں وہ صفت ذات ہو گی۔ تو جیسے ارادہ ہے تو غیر ارادہ اللہ کی ذات میں نہیں ہو سکتا۔ اختیار ہے' قدرت ہے' سمع' بصر ہے' کلام ہے' وغیرہ وغیرہ' یہ سب صفات وہ ہیں جو صفاتِ ذات ہیں۔ یہ جتنی بھی صفاتِ فعل ہوتی ہیں' مثلاً رزق ہے' تدبیر ہے' مغفرت کرنا' مغفرت کرتا ہے تو عذاب بھی دے دیتا ہے' یہ سب اللہ کی صفاتِ ذات ہی کی طرف لوٹ رہی ہوتی ہیں۔ یعنی رزق کیا ہے' رزق دینا اللہ کی قدرت ہے کہ وہ کسی کو رزق دے اور اللہ کی قدرت کہ وہ کسی سے رزق لے لے۔ تو اصلاً یہ صفت قدرت سے متعلق (related) ہوئی۔ تو یہ جو صفاتِ افعال ہیں یہ صفاتِ ذات ہی کے تحت ہوتی ہیں۔

تعداد و تقسیم صفات

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جو صفات ہیں ان کو اہل سنّت نے بیس یا اکیس (تھوڑا سا اختلاف ہے) میں تقسیم کیا ہے۔ اہلِ سنّت کے متقدمین کے ہاں آپ کو یہ تقسیم نہیں ملے گی' بلکہ اہل سنّت کے متاخرین کے ہاں ملے گی۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ کوئی تضاد ہے یا تناقض ہے یا اختلاف ہے۔ بالکل ایسا نہیں ہے' کیونکہ آپ کو معلوم ہے علوم اسی طرح چلتے ہیں' آہستہ آہستہ مدون ہوتے ہیں اور پھر ترتیب بن جاتی ہے۔ تو یہ جو بیس اکیس صفات ہیں' ان کے کہنے کا یہ مقصد بھی نہیں ہے کہ بس یہی صفات ہیں' یہ صفات ماننا ضروری ہیں' اگر تم نے ان صفات کو نہیں مانا تو تم نے خدا کو نہیں مانا' کسی اور کو مان لیا۔ یہ صفات تقسیم کی ہیں چار حصوں میں۔ ایک کو انہوں نے کہا صفت نفسیہ۔ یہ ایک ہی صفت ہے۔ پانچ کو انہوں نے کہا صفاتِ سلبیہ۔ سات کو انہوں نے کہا: صفات المعانی۔ اور اگلی سات کو کہا: الصفات المعنوية۔ اور اس کے بعد صفاتِ افعال جس کی میں نے وضاحت کر دی ہے کہ وہ انہی کی طرف لوٹ رہی ہوتی ہیں' لہٰذا وہ ساری صفات انہی کے تحت آ جائیں گی۔ تو یہ پانچ تقسیمات بن گئیں۔ یعنی: صفت نفسیہ' صفت سلبیہ' صفات المعانی' صفاتِ معنویہ اور صفاتِ افعال۔ تو یہ تقسیم اہلِ سنّت کے ہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات کے بیان میں پائی جاتی ہے۔ ان میں پہلی صفت ہے: صفت نفسیہ۔ اس صفت سے اصلاً اللہ کی ذات

کے ثبوت کہ اللہ کی ذات موجود ہے‘ اس طرف اشارہ مقصود ہے‘ اللہ کی ذات پر مزید کسی صفت کا بیان مقصود نہیں ہے۔ تو یہ صفت ذات ہے۔ صفت نفسیہ کا مطلب یہ ہے کہ بس اس سے ہم اُس کی ذات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ ہے۔ اس کو کہا گیا وجود۔ صفتِ نفسیہ کیا ہے: وجود۔ ہمارے علماء کے ہاں طویل تفصیل ہے کہ وجود اعتباری ہے یا حقیقی ہے یا عین ذات ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ جو بات ہمارے جاننے کی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں صفت وجود سے مراد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کا تحقق ہے‘ اللہ کی ذات کا ثبوت ہے۔ میں خارج بھی نہیں بول رہا‘ اس لیے کہ اللہ کا خارج داخل نہیں ہوتا کہ جیسے ہم کہتے ہیں کہ خارج میں وجود رکھتا ہے۔ اس میں تھوڑا سا تسامح ہے لیکن بول لیتے ہیں۔ یعنی اللہ کی ذات خارج میں وجود رکھتی ہے‘ اللہ کی ذات خارج میں موجود ہے۔ اب یہاں چند مختصر سے مباحث ہیں جن کی طرف اشارہ کرنے سے کچھ باتیں کھلیں گی اور امید ہے کہ تعلق مع اللہ میں مضبوطی بھی ہوگی۔ ان شاء اللہ!

وجود مشترک لفظی ہے

پہلی بات یہ کہ اگر صفت وجود ہے تو ہمارے پاس بھی صفت وجود ہے‘ ہم بھی موجود ہیں‘ زید‘ بکر بھی موجود ہے‘ کائنات بھی موجود ہے‘ اشجار وحجر‘ حیوانات بھی موجود ہیں۔ ہم نے تو ابھی یہ قاعدہ پڑھا ہے کہ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مانند کوئی نہیں ہے۔ تو کیا جب ہم کہہ رہے ہیں کہ اللہ بھی موجود ہے‘ صفت وجود اس میں بھی ہے‘ صفت وجود ہم میں بھی ہے‘ تو کیا ہم اللہ کے متوازی کوئی وجود رکھتے ہیں یا نہیں رکھتے؟ اس کا کیا جواب ہے؟ پہلی بات یہ ہے کہ نحن موجود باللہ ولیس مع اللہ ۔ یہ ایک عام سا جواب ہے جو ہمارے متکلمین اور صوفیاء دیتے ہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ موجود ہیں۔ باللہ کا مطلب ہے بقوتہٖ‘ بقولہٖ‘ بایجادہٖ‘ وباعطاءہٖ۔ یعنی ہم باللہ موجود ہیں مع اللہ موجود نہیں ہیں۔ اللہ نے وجود دیا‘ ہمارا وجود مستعار ہے‘ حقیقی نہیں ہے‘ ممکن الوجود ہے‘ واجب الوجود نہیں ہے۔ لہٰذا ہم باللہ موجود ہیں‘ مع اللہ نہیں۔ نعوذ باللہ‘ کبھی بھی ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم بھی موجود ہیں اور اللہ بھی اسی طریقے پر موجود ہے۔ حالانکہ اللہ کا وجود کہاں تمہارا وجود کہاں؟ تمہارا وجود ظلی ہے‘ تمہارا وجود مستعار ہے‘ تمہارا وجود عارضی ہے‘ تمہارا وجود فانی ہے۔ تم پر جس طرح وجود کے لفظ کا اطلاق ہو رہا ہے اس طرح اللہ پر نہیں ہو رہا۔ یہ سارے مباحث سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں لغت بھی پتا ہو اور ہم نے کچھ چیزیں پڑھی ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''وجود'' مشترک لفظی ہے۔ مشترک لفظی کا مطلب کیا؟ جیسے ہم کہتے ہیں: کلمة العین۔ وہ مشترک لفظی ہے کہ اس معنی کے لیے وضع کیا گیا اور اس معنی کے لیے بھی۔ اب عین سونے (gold) کو بھی کہتے ہیں۔ عین آنکھ کو بھی کہتے ہیں‘ عین چشمے کو بھی کہتے ہیں‘ عین جاسوس کو بھی کہتے ہیں‘ عین سردار کو بھی کہتے ہیں۔ تو یہ سب کے لیے الگ الگ وضع کیا گیا۔ تو جب ہم اللہ کے لیے لفظ وجود بول رہے ہیں تو کہہ رہے ہیں کہ مشترک لفظی اس معنی میں ہے کہ اللہ کے لیے جو وجود کا معنی اللہ کی ذات میں متحقق ہے وہ ہمارے ہاں نہیں ہے۔ لیکن لفظاً بس مشترک ہے۔ تو یہ مستعار وجود ہے‘ باللہ ہے‘ مع اللہ نہیں ہے۔ اللہ نے عدم سے تمہیں نکال دیا۔ اور اللہ وہ وجود ہے کہ جس پر عدم طاری ہونے کا احتمال ہی نہیں۔ جبکہ تم تو عدم میں تھے۔

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اَللّٰهُ مُنَوِّرُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ یعنی اللہ نے روشن کر دیا عدم کو وجود دے دیا۔ تم نہیں تھے تم پیدا ہو گئے۔ تم پیدا ہو جانے کے بعد ایک وجود رکھتے ہو‘ لیکن کبھی یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ وجود کچھ اسی طرح کا حاصل ہو گیا جس طرح اللہ کا وجود ہے‘ یا اسی معنی میں متحقق ہے۔ اس معنی میں متحقق نہیں ہے‘ یہ مشترک لفظی ہے۔

احکامِ عقلیہ ثلاثہ

پھر انہوں نے کہا اللہ واجب الوجود ہے' Necessary Being ہے اور تم contingent ہو' تم possible ہو' تم ممکن الوجود ہو۔ تو انہوں نے وجود کو تین حصوں میں تقسیم کیا' بلکہ وجود کو کیا تقسیم کیا' اس کو کہتے ہیں حکم عقلی۔ حکم عقلی تین ہیں۔ واجب ہونا' ممکن ہونا' ممتنع (impossible) ہونا۔ تو احکامِ عقلیہ تین ہیں اور کوئی اس سے باہر نہیں نکل سکتا۔ یعنی آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ نہ میں واجب الوجود ہوں' نہ میں ممکن الوجود ہوں نہ میں ممتنع الوجود ہوں۔ تم تینوں میں سے ایک میں لازمی ہو گے۔ واجب الوجود کیا ہے وہ ایک ہی ہستی ہے۔ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہے کہ جس سے وجود منفک یعنی الگ نہیں ہو سکتا۔ اس سے وجود کا الگ ہو جانا' اس کا عدم ہو جانا محال ہے' ممکن نہیں' ممتنع ہے۔ یہیں سے آپ ممتنع الوجود کو سمجھ لیں۔ اللہ کا عدم ممتنع ہے۔ ممکن الوجود کیا ہوتا ہے؟ ہم سب ممکن الوجود ہیں۔ ممکن الوجود وہ ہوتا ہے کہ جس کی اصل عدم ہوتی ہے۔ کئی دفعہ ہم یوں بیان کر دیتے ہیں کہ جس کا عدم اور وجود کا پلڑا برابر ہوتا ہے۔ نہیں! وہ ہوتا عدم میں ہے' پلڑا عدم کا بھاری ہے اس کا' اس کو وجود میں لانے کے لیے کسی خارجی اور بیرونی علت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو ہم نہ بھی ہوتے تو کچھ نہ ہوتا۔ ہم ممکن الوجود ہیں اور بہت سے لوگ ایسے ہوں گے کہ جو ممکن الوجود ہیں اور دنیا میں نہیں آئے۔ پوری کائنات ممکن الوجود ہے اور اس کے دلائل ہیں کہ کیوں ممکن الوجود ہے' حادث ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات واجب الوجود ہے۔ یہاں سے بھی آپ کو پتا چلا کہ وجود ایک معنی میں نہیں بولا جا رہا۔ وہ واجب الوجود ہے اور یہ ممکن الوجود ہے۔ اس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے عدم کا پردہ چاک کر کے بغیر کسی شے کے پیدا کیا۔ ہمارا عقیدہ ہے بغیر کسی شے کے۔ اور اس وجود میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے وجود کا کوئی حصہ نہیں' اللہ کے وجودِ ذاتی کا کوئی حصہ ممکن الوجود میں نہیں ہے۔ اور یہ عقیدہ رکھنا بھی اس لیے ضروری ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کسی صفت میں ہم شریک نہیں ہیں تو صفت وجود میں بھی شریک نہیں ہیں۔ یعنی اللہ کا جو وجود ذاتی ہے وہ اللہ کا ہے' اس میں ہم شریک نہیں ہیں۔ اللہ کی ذات کا کوئی حصہ' نعوذ باللہ' مخلوقات میں نہیں ہے۔ یعنی سب مخلوق ہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی۔ جو بھی ماسوی اللہ ہے' جو بھی ممکن الوجود ہے' وہ سب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ محض واجب الوجود ہیں۔ اس پر آپ غور کریں گے تو اللہ کے لیے احسان اور امتنان اور شکر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں' جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غزوۂ خندق کے موقع پر شعر پڑھ رہے تھے:

لو لا اللہ ما اھتدینا ''اللہ نہ ہوتا تو ہم ہدایت نہ پاتے۔''

اس میں اضافہ ہو سکتا ہے کہ لو لا اللہ ماجئنا الی الوجود ''اللہ نہ ہوتا تو ہم وجود بھی نہ پاتے۔''

اور اللہ کے ہونے سے بھی ہمارا وجود پانا ضروری نہیں تھا' اگر اللہ ہمیں عدم سے نہ نکالتا۔ کتنا بڑا فضل ہے کہ آپ سڑک پر چلتے ہوئے جا رہے ہیں' سورج کو دیکھ رہے ہیں' غروب ہو رہا ہے' آپ کائنات کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ عجیب احساس ہے ہو سکتا تھا کہ میں بالکل عدم میں رہتا اور عدم سے نہ نکلتا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے عدم سے نکال دیا ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے ایک عجیب وغریب قسم کے شکر اور امتنان کے جذبات پیدا ہونے چاہئیں کہ وہ ہستی ہے جس نے مجھے وجود کو دیکھنے کا موقع دیا اور پھر سب سے بڑھ کر نعمت یہ کہ اپنی پہچان کسی نہ کسی درجے میں کروائی۔ تو یہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ تو یہ صفتِ نفسیہ ہے جسے الوجود کہتے ہیں۔ ہم اس کو صفت تسامحاً کہتے ہیں' کیونکہ اس میں ہم کسی زائد صفت کی بجائے بس اللہ کی ذات کے تحقق کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ ذات ہے۔ لیکن ہم نے کوئی لفظ بولنا ہے تو وجود کا لفظ ہم بولیں گے۔ ہماری زبان کی کچھ حدود ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے بھی کئی دفعہ وہ حدود رہتی ہیں۔ اور اللہ نے بھی ہماری زبان میں یہ ہم سے گفتگو فرمائی ہے' لیکن فرمانے کے ساتھ ساتھ بتا دیا ہے کہ اپنی صفات کو میری صفات پر قیاس نہ کر لینا۔

اسماء اور صفات توقیفی ہیں

اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کے بارے میں ایک بحث یہ ہے کہ یہ توقیفی ہیں یا قیاسی؟۔یعنی اللہ کا ہم کوئی اسم ایسا رکھ سکتے ہیں کہ جو اللہ نے نہ بتایا ہو یا اللہ کی کوئی صفت ایسی تجویز کر سکتے ہیں جو اللہ نے نہ بتائی ہو؟ عموماً اہلِ سُنّت کا مسلک یہ ہے کہ صفات اور اسماء توقیفی ہیں۔ اور اس سے پتا چلتا ہے کہ تم نے اللہ کے بارے میں گفتگو جو اللہ نے بتایا ہے اس کے مطابق کرنی ہے۔ اور یہ واقعی بہت خطرناک جگہ ہے اور اس میں انسان کو مستقل اللہ سے پناہ مانگنی چاہیے' لیکن ہم تو ایسے ہی ہانکتے رہتے ہیں' حالانکہ معلوم ہونا چاہیے کہ کس کے متعلق گفتگو کی جارہی ہے۔ اور گفتگو اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر ہی ہوسکتی ہے' وگرنہ ہم اس ذیل میں چلے جائیں گے: الافتراء علی اللہ بغیر علم' اور یہ سب سے بڑا جرم ہے۔ اللہ کے بارے میں گفتگو ئیں کرنا کہ میرا یہ خیال ہے! ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اے سی میں اور چائے کی چسکی لیتے ہوئے گفتگو کی جائے کہ میرا خیال یوں ہے اور میرا خیال یوں ہے' تو یہ سب فضول باتیں ہیں۔ ہمیں یہاں گفتگو کرتے ہوئے بھی بہت گھبرانا چاہیے۔ اللہ کے نبی ﷺ کی حدیث سناتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبراتے تھے تو اللہ کے متعلق یوں کہنا کہ اللہ ایسا ہے' بہت خطرناک بات ہے۔ لہٰذا ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم نے نہیں پہچانا۔ بس اتنی بات جتنی صفات بتادی ہیں اور جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی صفت بیان کی ہے اس کا اقرار کرتے ہیں' اللہ کی تنزیہہ کے ساتھ۔ اس لیے کہ اللہ نے ہی کہا ہے نا: ﴿لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ﴾۔ تو اللہ کی صفت کا اقرار کرتے ہوئے ایسا مت کہہ دینا کہ اچھا اللہ بھی سمیع ہے تو ہم بھی سمیع ہیں۔ نعوذ باللہ! اللہ کی صفات بیان کرو تنزیہہ کے ساتھ۔ ہر صفت کے بعد لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ کا لاحقہ لگاؤ۔ یعنی اگر وہ سمیع ہے تو لیس کمثلہ فی سماعتہ او فی سمعہٖ اذا کان بصیرا فلیس کمثلہ شیء فی بصرہٖ' ولیس کمثلہ شیء فی وجودہٖ' ولیس کمثلہ شیء فی صفاتہ کلھا۔ لہٰذا ہم اللہ کے بارے میں مانتے ہیں' مثلاً اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر تہائی رات کو نزول فرماتے ہیں: ولکن لیس کمثلہ شیء فی نزولہ۔ اللہ کے نزول کے مانند بھی کوئی نزول نہیں ہے۔ ہمارا نزول تو حرکت ہوتی ہے نا تو جب ہم نے کہہ دیا تو اللہ تعالیٰ اس سے بھی ماوراء ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ تو زمان ومکان سے ماورا ہے۔ تو بس لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ کی بریکٹ لگا کر آپ صفات کا اقرار کریں۔ صرف صفت کا اقرار نہیں کرنا تنزیہہ کے ساتھ کرنا ہے۔

آج ہم نے جو چیزیں دیکھی ہیں وہ اسماء وصفات کی کچھ بنیادی بحث اور پہلی صفت' صفت نفسیہ' یعنی اللہ واجب الوجود ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ اسماء وصفات توقیفی ہیں یا نہیں ہیں؟ تو میں نے بتایا کہ عموماً مسلک یہ ہے' لیکن اس میں اہل سُنّت کی ایک مختصر سی تفسیر پائی جاتی ہے جو امام غزالیؒ اور امام رازیؒ نے بیان فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں اللہ کے اسماء توقیفی ہیں اور اللہ کے لیے اگر کوئی لفظ یا صفت یا فعل آجائے اس سے بھی اسم کا اشتقاق نہیں کریں گے۔ یعنی اسم توقیفی کا مطلب کیا ہے؟ اللہ نے اپنے لیے ایک فعل بیان فرمایا۔ قرآن نے کہا: ﴿وَمَکَرُوۡا وَمَکَرَ اللّٰہُ ؕ﴾ (آل عمران: ۵۴) اب یہ فعل آرہا ہے نا۔ مکر سے اسم فاعل بنائیں گے تو کیا بنے گا: ماکر (نعوذ باللہ!)۔ تو ہم اللہ کے بیان کردہ افعال سے بھی اسم کا اشتقاق نہیں کریں گے۔ اسماء توقیفی ہیں سارے کے سارے۔ تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے' نعوذ باللہ' اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء میں سے یہ سب ہیں۔ تو سارے کے سارے اسماء توقیفی ہیں۔ ہاں امام رازی اور امام غزالی فرماتے ہیں کہ اللہ کے لیے صفت کمال (اگر کوئی صفت ایسی ہو جس کے بارے میں معلوم ہوجائے کہ یہ صفت کمال ہے) کا اثبات کر سکتے ہو بغیر اسم کا اشتقاق کیے۔ یعنی صفت کا اثبات کر سکتے ہیں' اسم کا اشتقاق نہیں کریں گے۔ یعنی کوئی فعل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بارے میں صفت کمال کا آیا ہے تو ہم اس فعل سے نکلی ہوئی صفت کا اثبات کریں گے' لیکن اس سے اسم کا اشتقاق نہیں کریں گے۔ بس یہ ایک تفصیل ہے'

لیکن بہرحال عمومی قاعدہ یہی ہے جو میں نے آپ کو بتادیا کہ اَسماء اور صفات سارے کے سارے توقیفی ہیں۔ یعنی اللہ کے بتانے سے معلوم ہوتے ہیں‘ بغیر بتائے معلوم نہیں ہوتے۔

کمال اور کمالِ محض میں فرق

اب جب ہم نے کہا کہ صفت کا اثبات ہوسکتا ہے اور اسم کا نہیں ہوسکتا تو اللہ کے لیے صفت وہ ثابت ہوگی جو کمالِ محض ہے۔ کیا مطلب؟ کچھ لوگوں نے ایک قاعدہ بیان کیا جس پر ہمارے علماء اہل سُنّت نے رد کیا۔ وہ قاعدہ یہ تھا کہ جو صفتِ کمال انسان میں ہے وہ صفت کمال باولیٰ اللہ میں ہوگی اور جو صفت نقصان ہمارے اندر ہے اللہ تعالیٰ باولیٰ اس سے منزّہ ہوگا۔ یہ بات بظاہر ٹھیک لگ رہی ہے کہ جو صفت کمال ہمارے اندر ہے اللہ اس سے باولیٰ متصف ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ یہ جملہ درست نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے کچھ ایسی صفات اللہ کے ہاں ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کہیں کہ ہمارے لیے ہاتھ ہلانا صفتِ کمال ہے کہ نہیں ہے؟ لیکن وہ تو حرکت نہیں کرتا۔ حیوانات حرکت کرتے ہیں‘ ہمارے لیے یہ صفتِ کمال ہے۔ میں یہاں سے چل کر وہاں جاسکتا ہوں‘ صفت کمال ہے نا۔ لیکن میری یہ صفت کمال‘ میری احتیاج کی وجہ سے کمال ہے‘ کیونکہ مَیں وہ وجود ہوں جو ٹائم اینڈ سپیس میں باؤنڈ ہوں‘ میں محدود وجود ہوں‘ لہٰذا میرے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرنا کمال ہوگیا۔ تو یہ میرا کمال کہاں سے پھوٹا ہے‘ میری احتیاج اور فقر سے پھوٹ رہا ہے نا‘ کیونکہ میں سپیس کے اندر بند ہوں‘ لہٰذا حرکت میرے لیے کمال ہے۔ تو اگر ہم اس طریقے پر یہ استدلال قائم کریں تو ہم کہیں گے کہ چونکہ انسان کے لیے حرکت کمال ہے تو خدا کے لیے بھی حرکت کمال ہے کہ خدا کو بھی سپیس میں ثابت کردو۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ نہیں ہے۔ پھر اصول کیا ہے؟ ہر وہ صفت جو کمالِ محض ہے‘ یعنی جس میں کسی قسم کی کوئی احتیاج نہ ہو وہ صفت اللہ میں باولیٰ ثابت ہوگی‘ اور اگر اللہ نے اپنے لیے کچھ ایسی صفات کا ثبوت کیا ہے جو ہمارے اندر بھی ہیں لیکن ہمارے اندر کمالِ محض نہیں ہیں‘ جیسے دیکھنا ہمارے لیے کمال ہے لیکن کمالِ محض نہیں ہے‘ ہم ہر چیز تو نہیں دیکھ سکتے‘ اس کے لیے ہمیں آلہ چاہیے‘ بینائی چاہیے‘ روشنی چاہیے۔ کمالِ محض تو نہ ہوا۔ تو جب اللہ کے لیے وہ ثابت ہوگی تو تمام احتیاج اور فقر سے مبراء کر کے ثابت ہوگی۔ اللہ کے لیے دیکھنا یہ نہیں ہوگا کہ اُسے آلہ چاہیے‘ اُسے روشنی چاہیے‘ اُسے یہ چاہیے‘ اُسے وہ چاہیے۔ تو اللہ کے لیے صفت ثابت ہوگی اپنے کمال کے ساتھ‘ محض صفت کمال نہیں کمالِ محض‘ کمال خالص اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے ثابت ہوگا۔

بہرحال اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ غنی مطلق ہے‘ اللہ میں کوئی احتیاج نہیں ہے‘ اللہ ہر قسم کے فقر سے ماوراء ہے‘ لہٰذا کسی قسم کی وہ احتیاج جو انسان کے ناقص وجود کی وجہ سے اس کے اندر پیدا ہوگئی ہے اس قسم کی کوئی احتیاج اللہ کے ہاں نہیں ہے۔ تو اللہ کے بارے میں یہ ہے ہمارا تصور اور اس بات کے بیان کو ہم تسبیح کہتے ہیں: سَبَّحَ لِلّٰہِ‘ سُبْحَانَ اللّٰہِ‘ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِہٖ‘ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ۔ یہ سب کیا ہے؟ اللہ میں سے ہر نقص‘ احتیاج‘ کمی کی تنزیہہ ہورہی ہے۔ تو یہ کچھ بنیادی اصول تھے جو اللہ کے فضل سے ہم نے سمجھے ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ سب گڈمڈ سے ہوگئے ہوں‘ لیکن بعد میں اگر آپ اس کو دوبارہ دیکھیں گے تو شاید کچھ ترتیب قائم ہوجائے۔ بہرحال یہ اصول پیشِ نظر رہنے چاہئیں۔ اور یہ اللہ کو پہچاننے کے لیے اور اللہ سے صحیح تعلق استوار کرنے کے لیے اور اللہ کے قریب ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ یعنی اعتقادِ صحیح کے بغیر عمل نہیں ہوتا۔ تو اعتقاد پہلے ہے‘ جیسے امام بخاری علیہ الرحمہ نے ایک باب قائم کیا باب العلم قبل العمل۔ جہالت کے ساتھ عمل کئی دفعہ انسان کو نقصان بھی پہنچا دیتا ہے۔ بہرحال آج کی گفتگو مکمل ہوئی۔ جو صحیح بات ہے وہ اللہ تعالیٰ دلوں میں بٹھادے اور جو کچھ منہ سے غلط نکل گیا اس کو مٹادے۔ ❁❁❁

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah Al-A'raf

(The Heights)

Verse 11

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ
اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ⑪

"And We have certainly created you, [O mankind], and given you [human] form. Then We said to the angels, "Prostrate to Adam"; so they prostrated, except for *Iblees*. He was not of those who prostrated."

This verse elucidates the creation of Prophet Adam *(AS)*. Allah *(SWT)* uses the plural form in this case, because Adam *(AS)* is the father of all mankind as He *(SWT)* created the whole human race from this single being. Then Allah *(SWT)* commanded the angels to prostrate before Adam *(AS)* and they all obeyed their Lord *(SWT)* except *Iblees* (who was in fact a Jinn) who rejected the command of Allah *(SWT)* and did not prostrate to Adam *(AS)*.

These verses should be read in conjunction with verses 30 through 39 of Surah 2, al-Baqarah for understanding the complete picture. The words in which the command to prostrate before Adam *(AS)* is mentioned may give rise to the misapprehension that it was Adam *(AS)* as such who is the object of prostration. This misapprehension should be removed by what has been said here. The text makes it very clear that prostration before Adam *(AS)* was in his *(AS)* capacity, as the representative of all mankind and not in his *(AS)* personal capacity.

The successive stages of man's creation mentioned in this verse, means that Allah *(SWT)* planned the creation of man, made ready the necessary materials for it, and then gave those materials a human form. Then, when man had assumed the status of a living being, Allah *(SWT)* commanded all angels to prostrate before him *(AS)*.

It is quite difficult for one to appreciate fully the details of the origin of man's creation. We cannot fully grasp how man was created out of the elements drawn from the earth; how he was given a form and a well-proportioned one at that time and how Allah's *(SWT)* "Spirit" was breathed into him. It is quite obvious, though, that the Qur'anic version of man's creation is sharply at odds with the theory, of creation propounded by Darwin and his followers in our time. Darwinism explains man's creation in terms of his evolution from a variety of non-human and sub-human stages culminating in homo sapiens. It draws no clear demarcation line that would mark the end of the non-human stage of evolution and the beginning of the species called 'man'. Opposed to this is the Qur'anic version of man's creation where man starts his career from the very beginning as an independent and complete species, having in his entire history no essential relationship at all with any non-human species. Also, man is conceived as having been invested by Allah *(SWT)* with full consciousness and enlightenment from the very start of his life.

Therefore, "man" is rather seen as Allah's *(SWT)* Vicegerent on earth. What distinguishes the man from other animals, according to this doctrine, is not his capacity to speak or his gregariousness but the moral responsibility and trust with which he has been invested with. Thus, one's whole perspective with regard to man and everything relating to him is changed. Rather than looking downwards to the species lower than the human, the man will turn his gaze upwards.

Verse 12

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝

"[Allah] said, "What prevented you from prostrating when I commanded you?" [Satan] said, "I am better than him. You created me from fire and created him from clay [i.e., earth]."

This verse elucidates the reason for the rebellion of *Iblees* (a Jinn) against Allah *(SWT)* and, by extension, against all humans. The Jinn are created from fire whereas Allah *(SWT)* created the body of humans from clay. The Jinn are similar to humans in the manner that both are required to worship Allah *(SWT)* and follow Islam and both are given the free-will to exercise, therefore, like humans they may either be obedient or disobedient to their Creator *(SWT)*. Thus, when Allah *(SWT)* commanded *Iblees* (a Jinn) to prostrate before Adam *(AS)*, he became arrogant and jealous from the superiority given to the humans as he only saw the lower side of the man (clay) and failed to see the higher side (soul), therefore, he refused to obey and rejected Allah's *(SWT)* command.

Verse 13

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ﴿١٣﴾

"[Allah] said, "Descend from it [i.e., Paradise], for it is not for you to be arrogant therein. So get out; indeed, you are of the debased."

This verse explicates that the rebellious nature and arrogance of *Iblees* (Satan) earned him nothing but the wrath of Allah *(SWT)* and was thrown out of the Paradise.

It must be noted that implicit in the Qur'anic expression "sagharin" is the idea of misguided gratification with one's disgrace and indignity, for "saghir" is he who invites disgrace and indignity, upon himself. Now, Satan was a victim of vanity and pride, and for that very reason he defied Allah's *(SWT)* command to prostrate before Adam *(AS)*. Satan was therefore, guilty of self-inflicted degradation. False pride, baseless notions of glory, ill-founded illusions of greatness failed to confer any real eminence upon him. These only brought upon him disgrace and indignity. Satan could blame none but himself for this sordid end.

Verse 14

قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿١٤﴾

"[Satan] said, "Reprieve me until the Day they are resurrected."

Iblees (Satan) implored Allah *(SWT)* to grant him life till the Last Day so that he can prove that these humans whom Allah *(SWT)* has chosen above him and all other creations, are disobedient to Allah *(SWT)*.

Verses 15

قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝

"[Allah] said, "Indeed, you are of those reprieved."

Allah *(SWT)* gave him (*Iblees*) respite till the Day of Judgment. Thus, he became a staunch enemy to Adam *(AS)* and his progeny and is always planning to mislead them from the right path. This is the basis of the struggle between good and evil, truth and falsehood, with *Iblees* and his followers on one side and the Allah's *(SWT)* servants on the other.

Verses 16

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝

"[Satan] said, "Because You have put me in error, I will surely sit in wait for them [i.e., mankind] on Your straight path."

This verse alludes to the sheer misguided character of *Iblees* (Satan), stemming from his arrogance, vanity and jealousy. Instead of recognizing that it was he who was in error, *Iblees* was adamant that Allah *(SWT)* had misguided him! Not only that, but the eternally accursed Satan falsely insisted that as Allah *(SWT)* had "misguided" him and expelled him from the Paradise and His *(SWT)* Mercy, hence he would leave no stone unturned to misguide Allah's *(SWT)* servants, i.e., the progeny of Adam *(AS)* till the appointed time (The Hour), thus leaving for himself no chance of redemption whatsoever.

*[**Note**: We seek the refuge of Allah (SWT) from the accursed Satan, and disassociate ourselves from his false narrative and corrupt insinuations.]*

Verses 17

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝

"Then I will come to them from before them and from behind them and on their right and on their left, and You will not find most of them grateful [to You]."

This verse continues with the subject of the previous one and expounds that Satan went on to blaspheme further by vowing that he would (try to) mislead (all of) Allah's *(SWT)* servants from all sides and directions by raising doubts in them about their beliefs and causing confusion in their religion, thus luring them to the path of evil, away from the Right Path. *Iblees* added that most of humans will not show gratitude to Allah *(SWT)* but will follow their desires and the evil ways that he will lure them towards.

Thus, *Iblees* blasphemously challenged Allah *(SWT)* out of vanity, jealousy and arrogance, as his heart and fate had been sealed by then. What it really meant is that Satan would make use of the respite granted to him until the Last Day, and he would do so in order to "prove" that "man" did not deserve a position superior to his. The respite asked for by Satan and granted to him by Allah *(SWT)* includes not only the time but also the opportunity to mislead Man. The verse makes it clear that Allah *(SWT)* had granted Satan the opportunity to try to mislead Adam *(AS)* and his offspring. At the same time, it has also been made quite clear that Satan was not granted the power to lead men into error against their will. Thus, all that Satan can do is to cause misunderstanding, to make people cherish false illusions, to make evil and error seem attractive, and to invite people to evil ways by holding out to them the promise of immense pleasure and material benefits. He would have no power, however, to forcibly pull them to the Satanic way and to prevent them from following the Right Way. Accordingly, the Qur'an makes it quite plain elsewhere that on the Day of Judgement, Satan would address the men who had followed him in the following words:

> 'I had no power over you except to call you; but you listened to me: then blame me not, but blame yourselves' *(Surah Ibrahim 14: Verse 22)*.

It is thus clear that Satan wanted to continue enjoying his vain arrogance and that he was incensed that his weakness – arrogance and jealousy – was seen through and brought to full light. The underlying absurdity of the false statements and assertions made by *Iblees* is patently obvious.

Verses 18

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

"[Allah] said, "Depart from it [i.e., Paradise], reproached and expelled. Whoever follows you among them – I will surely fill Hell with you, all together."

In this verse it is reiterated that *Iblees* (Satan) has been commanded to be expelled and banished from the heavens in a disgraceful manner. Allah *(SWT)* also declares that whoever amongst the offspring of Adam *(AS)* will follow Satan and his evil ways, he will surely be thrown into the Hellfire in the Hereafter.

Verses 19

وَيٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

"And "O Adam, dwell, you and your wife, in Paradise and eat from wherever you will but do not approach this tree, lest you be among the wrongdoers."

There is a difference of opinion among Muslim scholars as to whether the Paradise mentioned in this verse was in the heavens or on this earth. Most of the scholars believe that it was in the heavens and Adam *(AS)* and Eve *(AS)* were sent down to earth afterwards. But it was not the Paradise the believers will dwell in after resurrection, because once a person enters that Paradise, he will live therein forever.

The verse elucidates that Allah *(SWT)* allowed Adam *(AS)* and Eve *(AS)* to reside in this Paradise for a while in order to test them and show them a glimpse of what was to come, i.e., how *Iblees* would be an enemy to them and their progeny and would try to lead them astray, and what man would get if he obeys Allah *(SWT)*. Adam *(AS)* and Eve *(AS)* were forbidden to go near a particular tree. There are conflicting opinions as to which tree it was, but it does not make any difference; the actual purpose was their test.

Verses 20

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝

"But Satan whispered to them to make apparent to them that which was concealed from them of their private parts. He said, "Your Lord did not forbid you this tree except that you become angels or become of the immortal."

This verse indicates that *Iblees* plotted against Adam *(AS)* and Eve *(AS)* and suggested to them, with treachery, by whispering into their ears. *Iblees* wanted to make them disobey their Lord *(SWT)* and thus reveal to them the private parts of their bodies that were hidden from them before. Therefore, he lied to them and told them that the reason that Allah *(SWT)* had forbidden them to eat from that tree (mentioned in the previous verse) was because He *(SWT)* did not want them to be like angels or live in this Paradise forever. It was, of course, a blatant lie told deceitfully by *Iblees*.

Verses 21

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۙ

"And he swore [by Allah] to them, "Indeed, I am to you from among the sincere advisors."

This verse further expounds the treachery of *Iblees* and the simplicity and honesty of Adam *(AS)* and Eve *(AS)*. *Iblees*, in order to put weight behind his lie and in an effort to persuade Adam *(AS)* and Eve *(AS)* into eating the forbidden fruit from the tree, even swore by Allah *(SWT)* that he was telling them the truth and that it was in their 'best interest' that they trusted him and followed him. As the next verse confirms, the simple folk *(AS)* had a slip.

Verses 22

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ
وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

"So he made them fall, through deception. And when they tasted of the tree, their private parts became apparent to them, and they began to fasten together over themselves from the leaves of Paradise. And their Lord called to them, "Did I not forbid you from that tree and tell you that Satan is to you a clear enemy?"

This verse indicates clearly that the 'error' and 'disobedience' by Adam *(AS)* and Eve *(AS)* of Allah *(SWT)* cannot be termed as a sin or even an iota of any such intent, as it only arose from the treacherous deception and confusion caused by the cursed *Iblees*.

When Adam *(AS)* and Eve *(AS)* ate the forbidden fruit form the tree, the private parts of their bodies that were hidden from them prior to that were made visible to them and thus they began to cover themselves with the leaves from the trees of Paradise, i.e., making them as a dress. This also alludes to the innate modesty and purity of both Adam *(AS)* and Eve *(AS)*. Thereafter, Allah *(SWT)* reminded them of His *(SWT)* commandments and warnings to Adam *(AS)* and Eve *(AS)* about the enmity and hatred of *Iblees* towards them and their offspring.

Verses 23

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۖ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

"They said, "Our Lord, we have wronged ourselves, and if You do not forgive us and have mercy upon us, we will surely be among the losers."

This verse clearly shows the difference between the behaviour of Adam *(AS)* and Eve *(AS)*, as opposed to the accursed Iblees. While Adam and Eve were remorseful of their action and begged for Allah's *(SWT)* forgiveness and mercy for their slip, *Ibless* remained arrogant and full of vanity even after committing blasphemy. When Adam *(AS)* and Eve *(AS)* committed that act of disobedience, they wanted to repent and return to Paradise but they could not find the words to use them in their prayers, so Allah *(SWT)* bestowed His *(SWT)* mercy and blessing on them and taught them the words, with which they could pray and ask for repentance. Thus Allah *(SWT)* pardoned them and accepted their repentance.

The narrative sheds light on the following significant points:

(i) Modesty and bashfulness are inherent in human nature. The primary manifestation of this instinct is seen in the sense of shame that one feels when one is required to expose the private parts of one's

body in the presence of others. According to the Qur'an, this bashfulness is not artificial, nor an outcome of advancement in human culture and civilization. Nor is it something acquired as some misguided thinkers contend. On the contrary, modesty has been an integral part of human nature from the very beginning.

(ii) The very first stratagem adopted by Satan in his bid to lead man astray from the Right Path consisted of undermining man's sense of modesty, to direct him towards lewdness and make him sexually deviant. In other words, the sexual instincts of man were taken by Satan as the most vulnerable aspect of human nature. Accordingly, he sought to weaken man's natural instincts of modesty and bashfulness. This devilish stratagem is still followed by the disciples of Satan in our time. For them, progress is inconceivable without exposing woman to the gaze of all and making her strip before others in one form or another.

(iii) Such is human nature that man scarcely responds to an unambiguous invitation to evil. Those who seek to propagate evil are, therefore, forced to present themselves as sincere well-wishers of humanity.

(iv) Man is naturally, drawn towards lofty ideals such as the attainment of superhuman positions and the securing of immortality. Satan achieved his first victory in his bid to mislead man by appealing to the latter's inherent desire to attain immortality. Satan's most effective weapon is to promise man a more elevated position than his present one, and then set him on a course that leads instead to his degradation.

(v) Here the Qur'an refutes the fairly popular view that Satan first misled Eve *(AS)* and later used her as an instrument to mislead Adam *(AS)*. The Qur'anic version of the story is that Satan attempted to mislead both Adam *(AS)* and Eve *(AS)*, and in fact both fell prey to his guile.

(vi) There is hardly any basis to assume that the forbidden tree had certain inherent qualities which could result in the exposure of Adam *(AS)* and Eve's *(AS)* private parts as soon as they had tasted its fruit.

Instead of the forbidden tree possessing any extraordinary qualities, it was rather man's disobedience to Allah *(SWT)* which led to his fall from his original state. Initially, Adam *(AS)* and Eve's *(AS)* private parts had remained hidden on account of special arrangements made by Allah *(SWT)*. Once they *(AS)* disobeyed, they were deprived of that special Divine arrangement, and were left to themselves *(AS)* to cover their nakedness if they so wished.

(vii) This was a way, of conveying to mankind for all time that whenever one disobeys Allah *(SWT)*, he will sooner or later be exposed; that man will enjoy Allah's *(SWT)* support and protection only so long as he remains obedient to Him *(SWT)*. Once man transgresses the bounds of his obedience, he will be deprived of Allah's *(SWT)* care and protection and left to his own self. The only way back to be in the good graces of Allah *(SWT)*, then, is to sincerely repent and beseech His *(SWT)* mercy.

(vii) Satan wanted to prove that man did not deserve, not even for a moment, the superior status which had been granted to him by Allah *(SWT)*. However, Satan failed in the very first round of his efforts to discredit man. Granted, man did not fully succeed in obeying Allah's *(SWT)* command; rather, he fell prey to the machinations of his arch-enemy, Satan, and deviated from the path of obedience. Nevertheless, it is evident even in the course of this first encounter that man is a morally superior being. This is clear from many a thing. First, whereas Satan laid claim to superiority, man made no such claim rather a superior status was bestowed upon him by Allah *(SWT)*. Second, Satan disobeyed Allah *(SWT)* out of sheer pride and arrogance. But far from openly revolting against Allah *(SWT)* out of his own prompting, man was disobedient under Satan's evil influence. Third, when man disobeyed Allah *(SWT)*, he did so unwittingly, not realizing that he was committing a sin. Man was beguiled into disobedience by Satan, who appeared in the garb of man's well-wisher. It was Satan who persuaded him to believe that in the fruit of the forbidden tree lay his good, that his action would lead him to the heights of goodness, not to the depths of evil. Fourth, when Satan was warned, rather than confessing his mistake and repenting, he clung even more adamantly to disobedience. But when man was told that he had slipped, he did

not resort to continued transgression as Satan did. As soon as man realized his mistake, he confessed his fault, returned to the course of obedience and sought refuge in Allah's *(SWT)* mercy.

This story draws a clear line between the way of Satan and the way that befits man. Satan's way is characterized by rebellion against Allah *(SWT)*, by arrogantly persisting in that rebellion even after having been warned, and by trying to mislead the righteously disposed towards sin and disobedience. As opposed to this, the way that befits man is to resist the evil promptings of Satan and to be constantly vigilant against Satanic machinations. But, if in spite of all these precautions, a man does swerve from the course of obedience, he should turn, as soon as he realizes his fault, to Allah *(SWT)* in penitence and remorse and make amends.

This is the lesson that Allah *(SWT)* conveys to man through this anecdote. The Qur'an seeks to impress upon the opponents of the Prophet *(SAAW)* that the way which they are following is the way of Satan. To become indifferent to Allah's *(SWT)* Guidance, to take satans among men and jinn as their protectors and to persist in disobedience despite repeated warnings, amounts to adopting a Satanic attitude. It demonstrates that they have fallen prey to the snares of the arch-enemy and have been totally overpowered by him. This attitude will lead to their total undoing just as it led to Satan's undoing. Anyone who has even an iota of understanding should heed and emulate the example of his fore parents – Adam *(AS)* and Eve *(AS)* – who repented and made amends after their disobedience.

This also refutes the false concept of 'The Original Sin' amongst the Christians. Islam does not accept the notion of 'The Original Sin' whereby Adam's *(AS)* disobedience to Allah *(SWT)* has been inherited by all his *(AS)* descendants. In other words, it does not accept that all human beings on earth are sinful because of their forefather's sin. Qur'an states that when Adam *(AS)* and Eve *(AS)* slipped, they beseeched and received Allah's *(SWT)* forgiveness.

Verses 24

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝

"[Allah] said, "Descend, being to one another enemies. And for you on the earth is a place of settlement and enjoyment [i.e., provision] for a time."

The verse clearly enunciates that *Iblees* and Adam *(AS)* became enemies forever. *Iblees* prayed to Allah *(SWT)* to grant him life till the Last Day so that he can prove that these humans whom Allah *(SWT)* has chosen above him and all other creations, are disobedient to Allah *(SWT)*, and thus he became an enemy to Adam *(AS)* and his progeny. This is the basis of the struggle between good and evil, truth and falsehood that has been going on for centuries and will continue till the appointed time, i.e., The Hour.

It must be noted that Allah's *(SWT)* command that Adam *(AS)* and Eve *(AS)* 'go down' should not be misunderstood to mean that their departure from Paradise was by way of punishment. The Qur'an has made it clear many a time that Allah *(SWT)* accepted Adam *(AS)* and Eve's *(AS)* repentance and pardoned them. Thus, the command does not imply punishment. It rather signifies the fulfilment of the Divine purpose for which man was created.

Verses 25

قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ع

"He [Allah] said, "Therein you will live, and therein you will die, and from it you will be brought forth."

This verse continues with the subject of the previous one and elucidates that when Adam *(AS)* and Eve *(AS)* were sent down to earth, they were told that the earth will be a dwelling place for them for a temporary period of time (till The Hour). They will live, die and then be buried in their graves, from which they will be then resurrected on the Day of Judgment. That goes for the entire human race from the first human to the last.

==========

And Allah *(SWT)* Knows Best!

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی چند فکر انگیز تالیفات

قرآن حکیم کی عظمت وتعارف اور حقوق ومطالبات
جیسے علمی وعملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآنِ حکیم اور ہم

اشاعت خاص 600 روپے، اشاعت عام 350 روپے

عظمت مصطفیٰ ﷺ، مقصد بعثت، اسوۂ رسول ﷺ اور
سیرت نبویؐ کے انقلابی پہلوؤں پر مشتمل مقالات کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

اشاعت خاص 600 روپے، اشاعت عام 350 روپے

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں اسلامی انقلاب
کے مراحل ومدارج اور لوازم

منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ

مجلد 500 روپے، غیر مجلد 300 روپے

سیرت مطہرہ کے دل پذیر موضوع پر ڈاکٹر صاحب
کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

سیرتِ خیرُ الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

صفحات 240، قیمت 180 روپے

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین
کی اہمیت وفرضیت، بعنوان:

توحیدِ عملی

سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ کی روشنی میں

اشاعت خاص 225 روپے، اشاعت عام 150 روپے

شرک کی حقیقت، اقسام اور دور حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اَقسامِ شرک

اشاعت خاص 125 روپے، اشاعت عام 70 روپے

امت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآن کی جامع ترین سورت

سُورۃُ الحَدید

(اُمُّ المُسَبِّحات) کی مختصر تشریح

اشاعت خاص 300 روپے، اشاعت عام 150 روپے

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں
اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت

اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

اشاعت خاص 200 روپے، اشاعت عام 180 روپے

مکتبہ خدام القرآن

K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور
فون 3-35869501(042)
ای میل maktaba@tanzeem.org ویب سائٹ www.tanzeem.org

Quarterly
Apr - June 2021

HIKMAT-E-QURAN

Lahore
Vol. 40 No. 2

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمت مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک پیدا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ